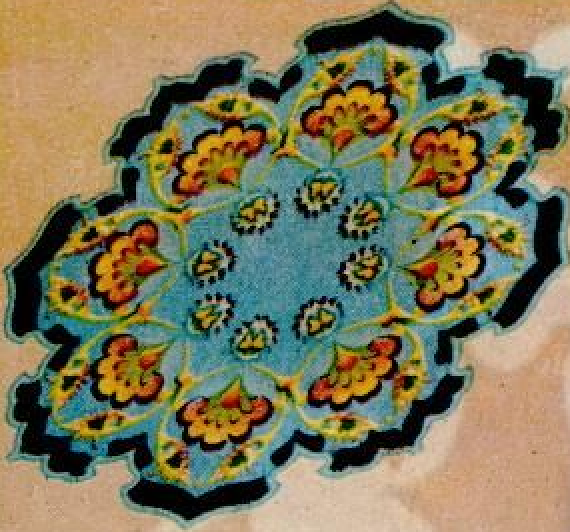
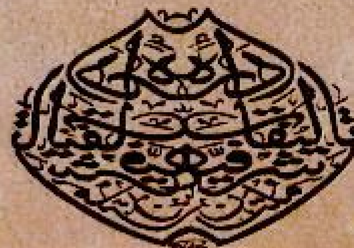


خطبات احتشام



خطیبِ پاکستان

حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی نوّر اللہ مرقدہٗ



اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
بیرون بوہڑ گیٹ نزد چوک فوارہ ملتان پاکستان
061-540513-541377
Mob: 0303-6662980
E-MAIL: Ishaq90@hotmail.com
Website
WWW.Taleefat-e-Ashrafia.Com

خطبات احتشام

جلد پنجم

خطیب پاکستان

حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

مرتب

مولانا محمد فیاض حیدر قاسمی

ادارہ تالیفات اشرفیہ

بیرون بوہڑ گیٹ ملتان۔ فون: 540513

باہتمام ....محمد اسحٰق عفی عنہ

نام کتاب ....خطبات احتشام

طباعت ....شرجیل شکیل پریس چوک شہیداں ملتان

ملنے کے پتے

☆ ادارہ تالیفات اشرفیہ۔ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

☆ طیب اکیڈمی۔ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

☆ مکتبہ امدادیہ۔ بیت الاشرف باغ حیات سکھر

☆ مکتبہ العارفی۔ جامعہ اسلامیہ امدادیہ۔ فیصل آباد

☆ ادارہ اسلامیات۔ انارکلی لاہور

☆ مکتبہ رحمانیہ۔ اردو بازار لاہور

☆ مولانا محمد اقبال نعمانی۔ مکی مسجد کراچی

اجمالی فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

محبت الٰہی

عشق رسول ﷺ

فہرست مضامین

شان بعثت

حدود عقل

جمالِ محمدیؐ

سال نو کا پیغام

شہادت حسین رضی اللہ عنہ

عاشورہ کی فضیلت

معرکہ حق و باطل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ

عَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی

اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰٓی

اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝

حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ

حضرت مولانا تقی عثمانی کی نظر میں

سفر ہندوستان سے واپسی ہوئی تو لاہور اسٹیشن پر اترتے ہی یہ المناک اطلاع دل پر بجلی کی طرح گری کہ حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ انتقال فرما گئے۔

انا اللہ وانا الیہ راجعون

مولانا کو اجلاس صد سالہ میں شرکت کے لئے دیوبند تشریف لے جانا تھا لیکن این او سی کے ملنے میں دیر لگی اور آپ بروقت نہ پہنچ سکے۔ لیکن دیوبند ہی میں اطلاع ملی تھی کہ مولاناؒ اجلاس ختم ہونے کے بعد ایک رات کے لئے دیوبند تشریف لائے تھے اور اگلے ہی دن دہلی روانہ ہوگئے۔ احقر دہلی پہنچا تو ایک روز عصر کے بعد احقر جامع مسجد دہلی کے مشرقی دروازے پر کھڑا تھا، وہاں سے سامنے دیکھا تو ایڈورڈ پارک کے کنارے مولاناؒ کسی صاحب سے محوِ گفتگو تھے۔ وہی خوش وضع لباس، وہی دلکش انداز و ادا، بالکل صحت مند، توانا اور چاق و چوبند! اس وقت احقر رفقاء کے ساتھ تھا اور ایک اور جگہ جانا تھا، اس لئے نیچے اتر کر، ملاقات کا موقع نہ تھا۔ خیال تھا کہ انشاء اللہ کسی اور موقع پر ملاقات ہو جائیگی۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ مولاناؒ کی آخری زیارت ہوگی۔ پھر ملاقات تو کجا اس پر شکوہ سراپا کی کوئی جھلک نظر نہ آسکے گی۔ مولاناؒ دہلی سے مدراس تشریف لے گئے اور مدراس ہی میں اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہیں پر جمعہ کے دن وفات ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولاناؒ کی ذات پاکستان کی ایک تاریخ تھی۔ وہ ان علماء کرام میں سے تھے جو قیام پاکستان کی جدوجہد میں شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ساتھ شریک رہے اور قیام پاکستان کے بات جیک لائنز میں ان کی مسجد اور انکا مکان مسلسل دینی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ ایک زمانے تک شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت والد صاحبؒ

، حضرت مولانا بدر عالم صاحب مہاجر مدنیؒ، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ اور دوسرے اکابر علماء کی مشاورت اکثر و بیشتر انہی کی قیام گاہ پر ہوتی رہی۔

مولاناؒ نظریہ پاکستان اور دو قومی نظریئے کے زبردست مناد تھے۔ وہ کٹر پاکستانی تھے اور اس معاملے میں انہوں نے کبھی کسی مداہنت یا مصالحت کو گوارا نہیں کیا۔ انہوں نے شرعی احکام کی تشریح کے سلسلے میں بھی ہمیشہ تصلب کا مظاہرہ فرمایا اور شریعت میں تحریف و ترمیم کی کسی کوشش و سازش کو قبول نہیں کیا۔ ۱۹۵۱ء میں ۳۱ علماء کا جو شرہ آفاق اجتماع ہوا اور جس میں تمام مکاتب فکر کے علماء نے متحد ہو کر ملک کے بائیس دستوری نکات مرتب کئے۔ نیز ۵۳ء میں انہی علماء کے جس اجتماع نے جو دستوری ترمیمات مرتب کیں وہ ملک میں دینی جدوجہد کی تاریخ کا انتہائی اہم واقعہ تھا۔ ان دونوں اجتماعات کے داعی مولاناؒ تھے اور یہ زیادہ تر مولاناؒ ہی کی مساعی کا نتیجہ تھا۔ عائلی قوانین پر غور کرنے کیلئے ابتداء میں جو کمیشن قائم ہوئے، اس میں مولاناؒ تنہا ایک عالم دین تھے جنہوں نے اس میں حق گوئی کا پورا حق ادا کیا، چنانچہ ان کا اختلافی نوٹ تاریخی حیثیت اختیار کر گیا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے عہد حکومت میں وہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے نظریات کے خلاف ڈٹ گئے اور اخبارات کے ذریعے عوام کو تحریف و ترمیم کے اس فتنے سے خبردار کیا۔ روئت ہلال کے مسئلے میں انہوں نے ہمیشہ شریعت کے مطابق جرأت مندانہ موقف اختیار کیا اس پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر ملک سے سوشلزم کو روکنے اور عوام کو اس کی دینی حیثیت سے آگاہ کرنے کے لئے مولاناؒ نے جس جانفشانی کے ساتھ ملک کے دورے کئے وہ مولاناؒ کی ناقابل فراموش خدمت ہے۔

مولاناؒ ملک کے مایہ ناز خطیب تھے۔ وہ خطابت میں ایسے دل کش اسلوب بیان کے موجد تھے جو ان سے شروع ہو کر انہی پر ختم ہو گیا۔ ان کی دل آویز خطابت نے سینکڑوں انسانوں کو دین سے قریب کیا اور شاید ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہو گا جہاں مولانا کی دل کش

آوازنہ گونجی ہو۔ ریڈیو پاکستان سے ان کے درس قرآن کا سلسلہ انتہائی مقبول عام ہوا اور بعد میں روزنامہ جنگ کے ذریعے شائع ہو کر وہ محفوظ بھی ہو رہا تھا۔ افسوس ہے کہ مولاناؒ کی وفات سے وہ نامکمل رہ گیا۔

دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈوالہ یار، مولاناؒ کی ایک اور قابل قدر یادگار ہے جس کا شمار ملک کی ممتاز ترین دینی درس گاہوں میں ہوتا تھا۔ خدا کرے کہ وہ پھر ایک بار اپنا سابقہ مقام حاصل کر سکے۔ آمین۔

مولاناؒ کی شخصیت بڑی باغ و بہار، شگفتہ اور دل کش تھی۔ ان کی مجلس میں اکتاہٹ کا گزر نہیں تھا۔ وہ بڑے حاضر جواب، بذلہ سنج اور خوش کلام عالم تھے۔ سیاست میں مولانا کے اندازِ فکر و عمل سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مولاناؒ کی شخصیت جن خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ انہوں نے پاکستان میں جو دینی خدمات انجام دیں اور ملک کی سیاسی تاریخ پر جو اثرات مرتب کئے ان سے مولاناؒ کے سیاسی مخالفین کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ ان کی وفات سے پورے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا، پوری ایک بساط تہہ ہو گئی۔ اور سیاست کا ایک منفرد مکتبِ فکر بند ہو گیا۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولاناؒ کی بال بال مغفرت فرمائے۔ انہیں جنت الفردوس میں مقامات عالیہ سے نوازے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق مرحمت فرمائے

آمیــــــن

محبت الٰہی

حدیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک فرشتہ آیا اور یہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو اس اُحد کے پہاڑ کو سونے کا پہاڑ بنا دیا جائے اور صرف یہی نہیں کہ اس کو سونے کا پہاڑ بنا دیا جائے بلکہ آپ جہاں کہیں بھی جائیں تو یہ پہاڑ آپ کے ساتھ ساتھ چلے تاکہ آپ کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں دنیا میں سونے اور چاندی جمع کرنے کیلئے نہیں آیا ہوں، میں تو اس لئے آیا ہوں کہ ایک وقت کھانا کھاؤں اور دوسرے وقت فاقہ کروں تاکہ میری امت اس سے سبق حاصل کرے۔

(ارشاد حضرت خطیب الامتؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محبّتِ الٰہی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحٰبِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ ○
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴿۲۴﴾ سُوْرَةُ التَّوْبَة

صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيمِ وَصَدَقَ رَسُولُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيمُ
وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِينَ وَالشَّاكِرِينَ
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○

تمہید بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! آج وعظ کی جس محفل میں ہم اور آپ شریک ہیں یہ کوئی رسمی تقریب اور رسمی جلسہ نہیں ہے بلکہ اسکا مقصد اصلاحِ احوال اور احکامِ شرع کی تبلیغ ہے۔ جسکی آجکل ہمیں بہت ضرورت ہے، اس لئے کہ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا چلا جارہا ہے ہم اور آپ دین سے دور ہوتے چلے جارہے ہیں، اور روزانہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ہم دوری اختیار کرتے چلے جارہے ہیں۔ اس لئے آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اور آپ بیٹھ کر سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں کہ واقعتاً ہمیں کونسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے، کونسا طرزِ زندگی اختیار کرنا چاہیے! اسی سلسلہ کی مجلس آج منعقد کی گئی ہے۔

فطری محبت اور قرآنی شہادت ابھی میں نے قرآن کریم کی ایک آیت آپ

حضرات کے سامنے تلاوت کی ہے جس میں اللہ تعالیٰ ہمیں اس بات کا حکم فرمارہے ہیں کہ ہم کو اللہ اور اسکے رسول سے محبت کرنی چاہئے۔ اور محبت بھی ایسی کرنی چاہئے کہ اس سے زیادہ محبت کسی سے نہیں ہونی چاہئے۔ یہاں تک کہ قرآن کریم نے ایسی چیزوں کی ایک فہرست بھی شمار کرادی ہے کہ جن چیزوں سے محبت کرنے پر ہم اور آپ مجبور ہیں۔

مثلاً اولاد کے دل میں ماں باپ کی محبت اور ماں باپ کے دل میں اولاد کی محبت ہوتی ہے اور یہ محبت خون کی محبت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خون کے اندر محبت ڈالدی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ماں باپ کے دلوں میں اولاد کی عقیدت باقی نہیں رہتی یا اولاد کے دلوں میں ماں باپ کی کوئی عقیدت اور عظمت باقی نہیں رہتی لیکن محبت پر دونوں مجبور ہوتے ہیں۔

مثال مثال کے طور پر (العیاذ باللہ) اگر کسی کی اولاد مُرتد ہوجائے تو باوجود اس کے کہ ایک عقیدہ نہیں رہا، ایک دین نہیں رہا جسکی وجہ سے اسکی عظمت اور اسکی عقیدت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اگر آپ اس کے باپ ہیں تو محسوس کریں گے کہ آپ کے دل میں اسکی محبت ہے، یہی محبت خون کی محبت ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ خون کی محبت کو اہمیت نہ دیا کریں اس لئے کہ خون کی محبت بالکل فطری محبت ہے۔۔۔ اسی طریقہ سے اگر کسی کے ماں باپ خدانہ کرے دین سے ہٹ جائیں، مرتد ہوجائیں تو اولاد کے دل میں خون کی محبت تو ہوگی لیکن ان کی عظمت اور عقیدت نہیں ہوگی، ان کے ساتھ کوئی ربط وضبط نہیں ہوگا، اٹھنا بیٹھنا نہیں ہوگا، ملنا جلنا نہیں ہوگا، البتہ فطری محبت اور قدرتی محبت ضرور ہوگی، اس لئے کہ خون کا جو علاقہ ہے اس علاقہ کی بناء پر انسان محبت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

مذہبی محبت نسبی محبت پر غالب ہوتی ہے

معلوم ہوا کہ محبت دو طرح کی

ہوتی ہے، ایک خون کی محبت ہوتی ہے اور ایک عقیدے کی محبت ہوتی ہے۔ لیکن واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خون کی محبت کمزور درجہ کی محبت ہے اور عقیدہ کی محبت اور دین کی محبت سب سے زیادہ مضبوط محبت ہے۔

ایک ایمان افروز واقعہ میرے دوستوں میں سے ایک صاحب جو یہیں کراچی (KARACHI) کے اندر رہتے ہیں، وہ نو مسلم خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، بڑے دولتمند ہیں اور بڑے تاجروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ایک دفعہ وہ یہ بتارہے تھے کہ انکے والد ہندو سے مسلمان ہوئے۔ ان کا قصہ تو بہت لمبا چوڑا ہے، مختصر یہ کہ وہ ایک ایسے محلے میں رہتے تھے جہاں ایک چھوٹی سی مسجد تھی، کبھی کبھی مسلمانوں کی کچھ باتیں ان کے کان میں پڑجایا کرتی تھیں، جس کی وجہ سے انہوں نے (تصوف کی کتاب) کیمیائے سعادت پڑھنا شروع کی۔ اس کے بعد قرآن کریم کا ترجمہ پڑھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ہدایت ڈال دی اور وہ کسی کے پاس جاکر مسلمان ہوگئے۔ لیکن گھر والوں کو یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ لڑکا مسلمان ہوگیا ہے۔ کسی نے ان کے گھر والوں سے جاکر کہدیا کہ تمہارا لڑکا مسلمانوں کے ساتھ جاملا ہے اور پانچوں وقت مسجد کے اندر نماز کیلئے جاتا ہے اس کے بعد ان کے ماں باپ نے یہ کیا کہ جب اذان ہوئی تو گھر میں تالا (قفل) لگادیا، اذان کی آواز سن کر وہ لڑکا مسجد کو جانا چاہا تو دیکھا کہ تالا لگا ہوا ہے، چنانچہ اس نے گھر میں ہی وضو کیا اور وضو کرکے اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ شاید تالا کھل جائے لیکن تالا نہیں کھلا، جب اس کو یہ اندازہ ہوگیا کہ اب مسجد میں جماعت کھڑی ہوگئی ہوگی تو اسی وقت اس نے اپنے گھر میں ہی کپڑا بچھایا اور "اللہ اکبر" کہہ کر نماز کیلئے نیت باندھ لی۔ اس کے ماں باپ، بھائی بہن سب دیکھ رہے ہیں اور حیران ہیں کہ یہ کیا کررہا ہے۔۔ انہوں نے خود ہی یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا، وہ کہہ رہے تھے کہ جس وقت میں سجدہ میں گیا ہوں اس وقت میرے ماں باپ اور میرے

بھائیوں نے مجھے اس قدر مارا۔اس قدر مارا کہ ان کا خیال تھا کہ اسکو یہیں پر ختم کردینا چاہیے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کا بچانا مقصود تھا اس قدر مار کھانے کے باوجود وہ بیچارے نہیں مرے۔ بالآخر چند روز کے بعد اپنا گھر چھوڑ کر کہیں چلے گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا تاجر بھی بنایا۔مال ودولت کے ساتھ ساتھ اولاد بھی عطا فرمائی اور ان اولادوں کو دیندار بھی بنایا۔

اصل تعلق عقیدے کا تعلق ہے

اندازہ لگایا آپ نے؟ وہی ماں ہے جو اپنی اولاد سے غایت درجہ کی محبت رکھتی ہے۔وہی باپ اور وہی بھائی ہیں جن کی محبت میں کوئی کمی نہیں ہوتی لیکن جب یہی ماں باپ اور بھائیوں نے یہ دیکھا کہ اسکا عقیدہ بدل گیا ہے۔اس کا دین بدل گیا ہے تو ان کی ساری کی ساری محبت عداوت میں تبدیل ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ خون کا تعلق کمزور تعلق ہے۔اصل تعلق عقیدہ اور دین کا تعلق ہے۔ جتنی جاذبیت انسان کے دین اور مذہب کے اندر ہے اتنی جاذبیت خون، زبان اور وطن میں نہیں ہے۔

تاریخی شہادت

آپ اندازہ لگایئے کہ ابوجہل اور ابولہب حضور اکرم ﷺ کے خاندان میں سے بھی ہے۔مکہ کا رہنے والا بھی ہے اور زبان بھی وہی بولنے والا ہے جو حضور اکرم ﷺ اور مسلمانوں کی زبان ہے۔تو وطن بھی ایک ہے۔ خاندان بھی ایک ہے اور زبان بھی ایک ہے لیکن چونکہ دین ومذہب الگ الگ ہے اس لئے ساری محبت،عداوت ودشمنی میں تبدیل ہوگئی۔ دوسری طرف حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہیں،شکل وصورت اور رنگت انکی حجاز والوں سے مختلف ہے۔ زبان الگ ہے۔ خاندان الگ ہے۔وطن الگ ہے۔حبشہ کے رہنے والے ہیں مگر اس کے باوجود حضور اکرم ﷺ نہ کبھی ابوجہل کو گلے سے لگاتے ہیں،نہ کبھی ابولہب کو گلے سے لگاتے ہیں اور گلے سے لگاتے ہیں تو بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو لگاتے ہیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ

فرمایا کہ اے بلال حبشی رضی اللہ عنہ ! تمہارا کونسا عمل اللہ کو اتنا پسند آگیا کہ میں نے شبِ معراج میں تمہیں اپنے سے آگے چلتے ہوئے دیکھا اور تمہارے چلنے کی آواز آرہی تھی (۱)۔ فرمایا کہ

حسنؓ زبصرہ بلالؓ از حبش صہیبؓ از روم
زخاکِ مکہ ابو جہل ایں چہ بوالعجبی ست (دیوان حافظ / ۳۲)

خدا کی شان دیکھئے کہ حسنؓ بصری، بصرہ سے چل کر آتے ہیں اور ایمان کے دولت سے مشرف ہوتے ہیں، صہیبؓ رومی، روم سے چل کر آتے ہیں اور مشرف باسلام ہوتے ہیں، بلالؓ حبشی، حبشہ سے چل کر آتے ہیں اور دولت ایمان سے بہرہ ور ہوتے ہیں لیکن مکہ کی خاک سے پیدا ہونے والا ابو جہل اور ابو لہب دولت ایمان سے محروم رہ جاتا ہے۔

فطری محبت کی قرآنی فہرست تو میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی محبت اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رکھ دی ہے انہیں میں سے اولاد کے دلوں میں ماں باپ کی محبت اور ماں باپ کے دلوں میں اولاد کی محبت بھی ہے۔ فرمایا کہ۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا

ہمیں اچھی طرح یہ معلوم ہے کہ تمہارے دل میں ماں باپ کی بھی محبت ہوگی، اولاد کی بھی محبت ہوگی، بھائیوں کی بھی محبت ہوگی، کنبے کی بھی محبت ہوگی، بیوی کی بھی محبت ہوگی، شوہر کی بھی محبت ہوگی اور اس مال و جائداد کی بھی محبت ہوگی جسکو تم

(۱) بخاری شریف باب مناقب بلال ابن ابی رباح

گن گن کر حفاظت سے جمع کر کے رکھتے چلے جارہے ہو یا جسکو تم تجارت میں لگائے ہوئے ہو۔ وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ

اور وہ عالی شان محلات اور وہ بڑے بڑے مکانات، جنکو تم پسند کرتے ہو، جو تمہارے دلوں کو لبھاتے ہیں، ان کی محبت بھی تمہارے دل میں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ بھی ہمارے حکیمانہ نظام کے تحت ہے، ان سب چیزوں کی محبت ہم نے ہی تمہارے دلوں میں رکھی ہے، اور محبت ہونی بھی چاہئے۔ کیونکہ اگر بیٹے کے دل میں ماں باپ کی محبت نہ ہو تو وہ ذمہ داریاں (حقوق) جو اللہ تعالیٰ نے اولاد کے اوپر ڈالی ہے کس طرح ادا کرے گا؟

اولاد کی ذمہ داریاں یاد رکھئے! اللہ تعالیٰ نے والدین کے سلسلہ میں اولاد کے اوپر بڑی بڑی ذمہ داریاں (حقوق) ڈالدی ہیں، بلکہ یہاں تک فرمادیا کہ خبردار! کبھی اپنے ماں باپ کو اُف بھی نہ کہنا، اور فقہائے کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کسی نے نفل نماز کی نیت باندھ رکھی ہے، اور ماں باپ میں سے کوئی آواز دیتا ہے، پکارتا ہے اور اولاد کو یہ معلوم ہے کہ اگر میں نے نیت توڑ کر جواب نہیں دیا تو میری ماں کا یا میرے باپ کا دل رنجیدہ ہوجائے گا، وہ یہ سمجھیں گے کہ بیٹا بڑا غافل اور بے ادب ہے، تو ایسے وقت میں اولاد کو چاہئے کہ نفل نماز کو توڑ دے اور اپنے ماں باپ کو جواب دے۔ اور جواب دینے کے بعد جب موقع ملے تو اسکی قضاء کرلے۔ جسکا مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد پر اتنی ذمہ داریاں ڈالی ہیں کہ ماں باپ کے دل پر میل بھی نہ آئے۔

والدین کی خدمت کا صلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واقعہ بیان فرمایا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں والدین کی فرمانبرداری سب سے بلند عبادت ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ چند مسافر ایک جگہ سے سفر پر روانہ ہوئے، وہ چلے جارہے تھے کہ راستہ میں بڑی زور کی آندھی آئی اور موسلادھار بارش ہونی شروع ہوئی،

بڑا زبردست طوفان تھا، یہ تینوں مسافر پناہ لینے کیلئے ایک پہاڑ کے غار میں چلے گئے۔ خیال یہ تھا کہ جب تک آندھی اور بارش ہے اس غار کے اندر پناہ لیں گے اور جب بارش تھم جائے گی تو یہاں سے نکل کر ہم اپنا راستہ لیں گے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جب یہ لوگ غار کے اندر داخل ہوگئے تو اتنی زور کی آندھی آئی کہ اوپر سے ایک چٹان لڑھک کر غار کے منہ پر آگئی جس کی وجہ سے غار کا منہ اس طرح بند ہوگیا کہ غار والے اب باہر نہیں نکل سکتے۔

وہ لوگ رونے گڑگڑانے لگے، انہوں نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ ہم میں سے ہر شخص نے کوئی نہ کوئی نیک کام خالصۃً لوجہ اللہ کیا ہوگا لہذا سب کے سب اپنے اپنے نیک کام کا حوالہ دیکر اللہ سے دعا مانگے کہ اے اللہ اس چٹان کو ہٹادے۔ چنانچہ سب نے اپنی اپنی نیکی کا حوالہ دیکر اللہ سے دعا کیا، کسی نے کہا اے اللہ میں نے فلاں نیک کام خالصۃً تیرے لئے کیا تھا، اے اللہ میں اپنے اس نیکی کا حوالہ دیکر یہ کہتا ہوں کہ اس کے وسیلہ سے تو اس چٹان کو ہٹادے۔ چٹان تھوڑی سی سرک گئی لیکن نکلنے کا راستہ نہیں بنا۔ دوسرے نے اپنے کسی اور نیک کام کا حوالہ دیکر دعا مانگی، چٹان تھوڑی اور ہٹ گئی لیکن اب بھی نکلنے کا راستہ نہیں بنا۔ پھر ان میں جو تیسرا شخص تھا وہ یہ کہنے لگا کہ اے اللہ! تجھے معلوم ہے کہ میں چرواہا ہوں، میرا کام بکریاں چرانا ہے، اور میرا یہ معمول ہے کہ میں شام کو جب بکریاں چرا کر واپس گھر آتا ہوں تو بکریوں کا دودھ دوہتا ہوں، اور دودھ دوہنے کے بعد سب سے پہلے میں اپنے ماں باپ کو دیتا ہوں اور جب ان سے بچ جاتا ہے تو پھر اپنے بیوی بچوں کو دیتا ہوں۔

اے اللہ! تجھے یہ معلوم ہے کہ ایک دن میں بکریوں کو چراتا ہوا بہت دور نکل گیا تھا جس کی وجہ سے مجھے گھر آنے میں دیر ہوگئی تھی، میرا باپ میرا انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا، جب میں آیا تو دودھ دوہ کر اس خیال سے کہ میرا باپ کھائے پیئے بغیر

سو گیا ہے دودھ لیکر ان کے سرہانے کھڑا ہو گیا اور میں نے اس خیال سے باپ کو نہیں جگایا کہ اگر میں نے جگا دیا تو انکی نیند خراب ہو جائے گی۔ ان کو تکلیف ہوگی۔ اس لئے میں نے ان کو جگایا نہیں اور برابر دودھ لئے ان کے سرہانے کھڑا رہا کہ جس وقت میرے والد کی آنکھ کھلے گی اس وقت میں ان کی خدمت میں دودھ پیش کروں گا۔ یہاں تک کہ کھڑے کھڑے رات کا کافی حصہ گذر گیا۔ لیکن ابھی تک نہ میں نے کھایا ہے نہ بیوی نے کھایا ہے۔ اور نہ بچوں نے کھایا ہے۔ بچے ساری رات بھوک سے بلبلاتے رہے مگر میں والد کے خیال سے ان کو بھی دودھ نہیں دے رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بچے دودھ پی لیں اور والد کو کم پڑ جائے۔

میں برابر کھڑا رہا۔ جب ان کی آنکھ کھلی اور یہ دیکھا کہ میرا بیٹا دودھ لئے کھڑا ہے تو انہوں نے فوراً پوچھا کہ تم نے مجھے اُٹھا (جگا) کیوں نہیں دیا؟ میں نے کہا۔ اس لئے نہیں جگایا کہ آپ کو تکلیف ہوگی۔ پھر میں نے ان کو دودھ پیش کیا۔ جب وہ خوب سیر ہو کر دودھ پی لئے تو پھر میں نے اپنے بیوی بچوں کو دیا۔ اے اللہ! تجھے معلوم ہے کہ میں نے اپنے باپ کے ساتھ جو یہ حسن سلوک کیا تھا وہ صرف تیرے واسطے کیا تھا۔ اے اللہ! میں اپنے اس عمل اور اس نیکی کا حوالہ دیکر تجھ سے دعا مانگتا ہوں کہ تو ہماری جان بچا لے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب اس آدمی نے اپنی اس نیکی کا حوالہ دیکر دعا مانگی ہے تو دیکھتا کیا ہے کہ تھوڑی دیر میں وہ چٹان ہٹ جاتی ہے اور باہر نکلنے کا راستہ مکمل کھل جاتا ہے۔ (۱) دیکھا آپ نے؟ ماں باپ کی اطاعت و فرمانبرداری میں اللہ نے کیا تاثیر رکھی ہے! اس نیکی کی بدولت اللہ تعالیٰ انسان کو بلاکتوں اور بربادیوں سے اور بڑے بڑے خطرات سے بچا لیتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ عبادت اللہ کو بہت پسند ہے۔

---

(۱) بخاری شریف، احادیث الانبیاء / ۳۲۰۶، صحیح مسلم / ۴۹۲۶، سنن ابی داؤد / ۲۹۳۹ مسند احمد / ۵۰۰۲

عبادت رب کے بعد اطاعت والدین کا حکم اور وجہ بھی اسکی سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ اگر ہم اور آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کائنات میں اللہ سے بڑھ کر ہمارا کوئی نہیں ہے، اس لئے کہ ہمیں اور آپ کو زندگی اور وجود دینے والا اللہ ہے، وہ ہمارا خالق ہے، اور یہ وجود دینا اللہ کا سب سے بڑا احسان ہے۔ لیکن یہ کہ وجود کا ذریعہ اللہ نے کس کو بنایا؟ وجود کا ذریعہ اللہ نے ماں باپ کو بنایا ہے! تو وجود دینے والا اللہ ہے اور وجود کا ذریعہ ماں باپ ہیں، لہذا ہمارے سب سے بڑے مُحسن اللہ تعالیٰ ہیں اور اللہ کے بعد ہمارے سب سے بڑے مُحسن ماں باپ ہیں۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں اپنی عبادت اور بندگی کا ذکر فرمایا ہے وہیں ساتھ ساتھ ماں باپ کی فرمانبرداری اور ان کے احسان کا بھی تذکرہ فرمایا ہے۔ فرمایا کہ

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت اور بندگی کے ساتھ ساتھ ماں باپ کے ساتھ حُسن سلوک کا بھی ذکر فرمایا ہے۔

محبت ہی سکھاتی ہے آداب فرزندی تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر اولاد کے دل میں ماں باپ کی محبت نہ ہو تو کوئی اولاد اپنے ماں باپ کی ناز برداری نہیں کر سکتا، قدم قدم پر ان کی دلداری اور دلجوئی نہیں کر سکتا، جب انسان کے دل میں محبت ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے دلداری کرنا، دلجوئی کرنا، خدمت کرنا اور اطاعت کرنا یہ سب آسان ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ میرے دوستو! محبت ایک ایسی چیز ہے کہ اگر کسی انسان کے دل میں پیدا ہو جائے تو انسان پہاڑ کو بھی کھود دیتا ہے اور انسان کیلئے مشکل سے مشکل کام بہت آسان اور سہل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ ایک لڑکے کو اس کے ماں باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی خدمت کے اوپر لگا دیجئے تو وہ کبھی اس

طریقے سے خدمت نہیں کرسکتا جس طریقے سے وہ اپنے ماں باپ کی خدمت کرتا ہے۔

اولاد کی محبت فطری ہے دوسری بات یہ ہے کہ اگر ماں باپ کے دل میں اولاد کی محبت نہ ہو تو وہ اولاد کی وہ ذمہ داریاں (حقوق) جو اللہ تعالیٰ نے ماں باپ پر ڈالی ہیں کبھی پوری نہیں کرسکتا۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کے دلوں میں اولاد کی محبت اور اولاد کے دلوں میں ماں باپ کی محبت اس لئے پیدا کردیتے ہیں تاکہ دونوں ایک دوسرے کی ذمہ داریوں (حقوق) کو پورا کریں اور اس محبت کی وجہ سے دونوں کا کام آسان ہوجائے۔

اگر مال کی محبت نہ ہوتی تو۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مال کی محبت بھی ہمارے دلوں میں رکھ دی ہے، اس لئے کہ اگر ہمارے اور آپ کے دلوں میں مال کی محبت نہ ہو تو ہم اور آپ مال کا حق بھی ادا نہیں کرسکتے، جہاں جائیں گے، جس دوکان پر بیٹھیں گے، وہیں پر پیسے چھوڑ کر کھڑے ہوجائیں گے، یہ بات ہمیشہ یاد رکھئے کہ جو چیز انسان کی نظروں میں بہت اہم ہوتی ہے، جس پر اسکا دل لگا ہوا ہوتا ہے، اسکو انسان کبھی نہیں بھولتا۔ اگر آپ کی جیب میں رقم موجود ہے اور آپ کسی بس (BUS) وغیرہ کے اندر سفر کررہے ہیں تو آپ کے دل میں یہی بات ہوگی کہ اتنی بڑی رقم میری جیب میں موجود ہے لہذا آپ اس کے اوپر بار بار ہاتھ رکھتے رہیں گے، آپ کا ہاتھ جیب پر سے ہٹے گا نہیں لیکن فرض کرلیجئے کہ اگر آپ کو دولت کے ساتھ ذرہ بھی تعلق اور محبت نہ ہو تو جہاں آپ بیٹھیں گے وہیں پر اس کو چھوڑ کر کھڑے ہوجائیں گے، جس جگہ اس کو رکھیں گے بھول جائیں گے، یاد بھی نہیں رہے گا کہ کہاں رکھی ہے۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ مال کا حق بھی انسان اس وقت تک ادا نہیں کرسکتا جب تک کہ اس کی محبت اس کے دل میں پیدا نہ ہوجائے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول اسی لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

اے اللہ! میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے دل میں مال کی محبت نہیں ہے، مال کی محبت تو میرے دل میں بھی ہے، اور فرمایا کہ میں یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں؟ جبکہ آپ نے خود قرآن کریم میں یہ خبر دے دی ہے کہ مال کی محبت ہمارے خون میں ڈال دی گئی ہے۔ فرمایا کہ۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ

چند چیزوں کی محبت اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ڈالدی ہے جس میں سے سونے چاندی کی محبت بھی ہے۔ "ذہب" کہتے ہیں سونے کو اور "فضہ" کہتے ہیں چاندی کو۔ تو ان چیزوں کی محبت اللہ نے ہمارے دلوں میں ڈال دی ہے۔

عہد فاروقی کا سبق آموز واقعہ واقعہ یہ پیش آیا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں علاقے کے علاقے اور ملک کے ملک فتح ہوتے چلے جا رہے تھے۔ جس کی وجہ سے ایک مرتبہ قیصر و کسریٰ کے خزانے ان کے سامنے لا کر جمع کر دیئے گئے، اور وہ بھی اس طریقہ سے جمع کئے گئے کہ انہیں لا کر ایک میدان کے اندر ڈھیر لگا دیا گیا، اور یہ لکھا ہے کہ سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کا اتنا بڑا ڈھیر تھا کہ اگر دونوں طرف ایک ایک آدمی کھڑا ہو جاتا تو ادھر کا آدمی ادھر کے آدمی کو نہیں دیکھ سکتا۔

یہاں ایک بات میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس دور کے لوگوں میں کتنی دیانت اور کتنا تقویٰ تھا کہ کھلے میدان کے اندر خزانہ کا اتنا بڑا ڈھیر پڑا ہوا ہے، اور وہاں لشکری اور سپاہی بھی موجود ہیں، عام مسلمان بھی موجود ہیں لیکن ایک بھی ایسی شکایت نہیں آئی کہ رات میں کوئی شخص اس میں سے کچھ چرا کر لے گیا ہے یا کسی نے اس میں ڈاکہ ڈال دیا ہے۔ ورنہ آپ بتایئے کہ اگر آپ کے ملک میں اس طرح ہو تو کیا ہوگا؟ یہی ہوگا کہ صبح تک اس مال و دولت کا نام و نشان بھی نہیں رہے گا!

ابل یورپ کے ایمانداری کا ایک واقعہ | مولانا عبد الماجد دریا بادی رحمۃ اللہ علیہ

نے ایک بڑا اچھا واقعہ نقل کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یورپ (EUROPE) کے کسی علاقے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک عورت کچھ رقم لیکر کہیں جارہی تھی۔ راستہ میں اسکو یہ خیال آیا کہ میں اس رقم کو گنوں اور شمار کردوں چنانچہ اس نے رومال کے اندر سے نوٹ نکالا اور گننا چاہ رہی تھی کہ وہ ہاتھ سے گر گیا۔ اسی وقت ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا جس کیوجہ سے وہ ساری کرنسی (نوٹ) (CURRENCY) ہوا میں اڑ گئی۔ اب یہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہی ہے مگر چونکہ ہوا کی رفتار اس سے زیادہ تیز تھی اس لئے وہ ہوا کے ساتھ ساتھ آگے آگے بھاگے چلے جارہے ہیں۔ اور راستے بھی بڑے چوڑے چوڑے تھے۔ جنکو وہ پار نہیں کرسکتی تھی آخر وہ کرنسی ہوا میں غائب ہوگئی۔

مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ نے لکھا ہے اس نے جاکر اس علاقہ کے تھانے میں یہ رپورٹ (REPORT) لکھوائی کہ میرے پاس اتنی مقدار میں کرنسی تھی۔ میں کہیں جارہی تھی۔ راستہ میں وہ میرے ہاتھ سے گر گئی اور ہوا کے اندر تیزی کے ساتھ اڑ کر غائب ہوگئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کن کن لوگوں نے اٹھائی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ضرور کسی نے اٹھائی ہوگی اس لئے میں تھانہ کے اندر رپورٹ (REPORT) لکھوا رہی ہوں۔ مولانا نے لکھا ہے کہ جب وہ تھانہ کے اندر رپورٹ لکھوانے کیلئے گئی تو تھانے دار نے کہا کہ ابھی ابھی ہمارے پاس پندرہ سولہ آدمی کچھ کرنسیاں جمع کرا کے گئے ہیں۔ اگر وہ آپ کی ہیں تو آپ یہ بتلادیں کہ وہ کونسی کرنسی ہیں اور کس قیمت کی ہیں؟ اس نے بتلادیا۔ تو تھانے دار نے اس کے سامنے کرنسی رکھتے ہوئے کہا کہ یہ ہے وہ کرنسی! اگر آپ اس کو پہچانتی ہیں تو لے جاسکتی ہیں۔ اس عورت نے کہا، جی ہاں! یہی میری کرنسی ہے۔ اور یہ کہہ کر وہ لے گئی۔

مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ کا اظہار تاسف | مولانا عبد الماجد دریا بادی رحمۃ اللہ علیہ

نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ یورپ کے ایک ملک کا ہے۔ حجاز کا نہیں ہے، شام کا نہیں ہے، یمن کا نہیں ہے، عراق کا نہیں ہے یا کسی اور اسلامی ملک پاکستان، افغانستان وغیرہ کا نہیں ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ فرض کرلیجئے کہ اگر یہ واقعہ آپ کے ملک میں پیش آتا تو ایمانداری سے بتایئے کہ راستہ میں جو جو آدمی اس کرنسی کو اٹھالیتا تو کیا کسی کو توفیق ہوتی کہ اس کو لے جاکر تھانہ میں جمع کرادے؟ اور اگر فرض کرلیجئے کہ وہ جاکر تھانہ میں جمع کرا بھی دیتا تو کیا تھانیدار ان کرنسیوں کو مالک کے حوالہ کردیتا؟ بلکہ تھانیدار صاحب تو یہ کہتے کہ جن لوگوں کو یہ کرنسیاں ملی ہیں وہ بڑے بے وقوف نکلے کہ ہمارے پاس لاکر جمع کراگئے، چلو یہ ہماری ہی کرنسیاں ہیں، انہیں مالک کے حوالہ کرکے ہم بے وقوف کیوں بنیں؟

حمیت نام تھی جس کی گئی تیمور کے گھر سے

مولانا کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مذہب اسلام اور دین اسلام ایسا دین ہے جو اپنے ماننے والوں کو تمام ادیان سے زیادہ دیانتدار اور ایماندار بناتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ آج ہماری حالت ایسی ہوگئی ہے کہ اس قسم کا واقعہ ہمارے علاقے کے اندر شاید ہی پیش آئے گا، لیکن وہاں کی حالت دیکھئے کہ جن جن لوگوں کو وہ کرنسی ملی وہ جاکر تھانہ میں جمع کرادیئے اور جب یہ عورت رپورٹ لکھوانے گئی تو اس سے پہلے ہی سے وہ کرنسی وہاں موجود تھی۔

مال کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعا

تو میں عرض کررہا تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک میدان کے اندر سونے چاندی، ہیرے جواہرات کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس خزانہ کے پاس تشریف لے گئے، اور اسے دیکھ کر ہاتھ اٹھایا اور فرمایا کہ اے اللہ! میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے دل میں اس مال کی محبت نہیں ہے بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ اس خزانہ اور اس ڈھیر کی محبت میرے دل میں ہے، اور میں کیسے انکار کرسکتا ہوں؟ جبکہ قرآن کریم میں تونے یہ

ارشاد فرمایا ہے

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ

قرآن کریم یہ خبر دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل میں سونے چاندی کی محبت پیدا کر دی ہے۔ اے اللہ! میں یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں کہ اس ڈھیر کی محبت میرے دل میں نہیں ہے، بلکہ میرے دل میں اسکی محبت ہے لیکن میں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگ رہا ہوں کہ اے اللہ! اس مال کے اندر جتنا خیر ہو وہ مجھ سے وابستہ ہو جائے اور اس مال میں جتنا شر ہو، جتنی خرابی ہو اے اللہ! اس سے ہمیں محفوظ فرما۔

دنیا کی بیشتر چیزوں میں خیر و شر دونوں پہلو موجود ہیں میرے دوستو! مال و دولت ایک ایسی چیز ہے کہ جس کے اندر دونوں پہلو ہیں، خیر کا پہلو بھی ہے اور شر کا پہلو بھی ہے، جیسے یہ سمجھئے کہ ایک سلائی ہے جس کے ایک کنارے پر شہد لگا ہوا ہے اور دوسرے کنارے پر غلاظت اور پاخانہ لگا ہوا ہے۔ دنیا کی تمام کی تمام چیزیں تقریبا اسی نوعیت کی ہیں کہ ان میں ایک پہلو خیر کا ہے، دوسرا پہلو شر کا ہے، لیکن چند چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے اندر خیر ہی خیر ہے، شہد ہی شہد ہے، گندگی کا کوئی شائبہ نہیں ہے اور بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے اندر گندگی ہی گندگی ہے، شر ہی شر ہے، خیر کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

بعض چیزیں سراپا خیر یا سراپا شر ہیں مثلاً انبیاء کرام علیہم السلام کی ذوات اقدس ہیں۔ ملائکۃ اللہ اور فرشتے ہیں، قرآن کریم اور وہ مقامات مقدسہ ہیں کہ جہاں پر اللہ کی عبادت اور بندگی کی جاتی ہے، ان کے اندر خیر ہی خیر ہے، شر کا کوئی شائبہ نہیں ہے، اسی لئے حدیث میں آتا ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ زمین کے وہ خطے کہ جن کے اوپر مسجدیں بنی ہوئی ہیں دوسرے تمام خطوں سے بہتر اور افضل ہیں

اور فرمایا کہ زمین کے وہ خطے اور وہ علاقے جہاں پر بازار بنے ہوئے ہیں دوسرے تمام علاقوں سے بدتر ہیں۔ اس لئے کہ بازار میں جب انسان یہ کاروبار میں لگ جاتا ہے تو وہ اللہ کی طرف سے غافل ہوجاتا ہے، تو ایک جگہ اللہ سے غافل بنانے والی ہے اور ایک جگہ اللہ کو یاد دلانے والی ہے۔ فرمایا کہ جہاں یاد دلانے والی عمارتیں بنی ہوئی ہیں وہ زمین کا بہترین حصہ ہیں اور جہاں خدا سے غافل کرنے والی عمارتیں بنی ہوئی ہیں وہ اس روئے زمین کا بدترین حصہ ہیں۔

تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن میں خیر ہی خیر ہے، شر کا کوئی نام ونشان نہیں ہے جیسے انبیاء کرام اور فرشتے ہیں کہ جن میں معصیت اور نافرمانی کا کوئی شائبہ نہیں ہے، انبیاء کرام علیہم السلام بھی معصوم ہیں اور ملائکۃ اللہ اور فرشتے بھی معصوم ہیں۔ اور بعض دوسری چیزیں ایسی ہیں کہ جن میں شر ہی شر ہے خیر کا کوئی نام ونشان نہیں ہے، وہ شیاطین وابلیس ہیں۔

شیاطین وابلیس بھی اللہ کی مخلوق ہیں یادرکھئے! شیاطین وابلیس بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ اور وہ جو قرآن کریم میں ہمیں اور آپ کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ ہم اپنی زبان سے یہ دعا کریں کہ اے اللہ! ہم مخلوقات کے شر سے تیری پناہ مانگتے ہیں تو ان مخلوقات میں شیاطین وابلیس بھی داخل ہیں، فرمایا کہ۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ○ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ○ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ○ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ○ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ○

اے اللہ! میں تیری مخلوقات میں سے جتنی چیزیں شر کی ہیں، ان سب سے پناہ مانگتا ہوں، معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام بھی مخلوقات میں شامل ہیں۔ ملائکۃ اللہ اور فرشتے بھی مخلوقات میں شامل ہیں لیکن یہ سرتاپا خیر ہی خیر ہیں، ان میں شر کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ اور ابلیس وشیطان بھی مخلوقات میں شامل ہے لیکن سرتاپا

شر ہی شر ہے اس میں خیر کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

بس! ان دونوں قسم کے مخلوقات کو نکال دیجئے۔ ان دونوں کے الگ کرنے کے بعد کائنات میں جتنی مخلوقات اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں ان تمام کی حیثیت یہ ہے کہ ان کے ایک سرے پر خیر ہے تو دوسرے سرے پر شر ہے۔

اولاد خیر بھی ہے، شر بھی ہے

مثال کے طور پر اولاد ہے، وہ خیر بھی ہے، شر بھی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اولاد کو صلاح اور نیکی کی توفیق عطا فرمائی ہے تو وہ خیر ہے لیکن فرض کرلیجئے کہ اگر کسی کو ایسی اولاد مل جائے جو ماں باپ کے نام کو بھی بد نام کرے، خاندان کے نام کو بھی بدنام کرے تو وہ شر ہے۔ ایسی اولاد کے حرکات کو دیکھتے ہی ماں باپ یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ ایسی خراب اور بُری اولاد پیدا ہوتے ہی مرجاتی۔ قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اولاد کے ذریعہ ماں باپ کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔ فرمایا کہ۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

اللہ تعالیٰ بعض اوقات دنیا کی زندگی میں اولاد کے ذریعہ ماں باپ کو سزا دیتے ہیں اور اولاد ان کیلئے عذاب بن جاتی ہے۔

مال ودولت موجب نجات بھی ہے اور باعث وبال بھی

تو میرے دوستو! میں یہ عرض کررہا تھا کہ مال کے اندر خیر کا پہلو بھی ہے، شر کا پہلو بھی ہے۔ اگر آپ مال کو اطاعت وفرمانبرداری کے اندر خرچ کررہے ہیں تو وہ خیر ہی خیر ہے اور اگر آپ اس کو اللہ کی نافرمانی کے اندر خرچ کررہے ہیں تو وہ شر ہی شر ہے۔ اگر آپ مال کی حفاظت کرکے اس کے حقوق ادا کررہے ہیں تو یہی مال آپ کیلئے موجبِ نجات ہے۔ ورنہ باعثِ وبال۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ

نعم المال الصّالح للرّجل الصالح

اگر آدمی نیک ہے تو اس کے پاس جو مال آئے گا وہ بھی صالح مال کہلائے گا۔ اور اگر آدمی نیک نہیں ہے تو اس کے پاس جو مال آئے گا وہ مال غیر صالح ہو گا۔ اس کے اندر شر کا پہلو غالب ہو جائے گا۔

صحت وتندرستی میں بھی دونوں پہلو ہیں اسی طرح صحت وتندرستی ہے، یہ بھی اللہ کی نعمت ہے لیکن اس میں بھی خیر وشر دونوں پہلو موجود ہیں۔ یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ۔

نعمتان مغبون فیھما کثیر من الناس الصحۃ والفراغ (۱)

فرمایا کہ دو نعمتیں ایسی ہیں کہ جن سے لوگ ناواقف اور بے خبر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑے خسارے کے اندر ہیں، اس نعمت کی قدر نہیں جانتے، فرمایا کہ ایک نعمت تو انسان کی جسمانی اور بدنی صحت ہے اور دوسری فرصت ہے۔

فرصت اللہ کی نعمت ہے فرصت بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے، اسی لئے شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب تمہیں کوئی ذمہ داری پوری کرنی ہو اور فرصت بھی میسّر ہو تو خبردار! اس فرصت کو رائیگاں اور ضائع مت کرنا، اس فرصت سے فائدہ اٹھالینا۔ ممکن ہے کہ تمہارا کوئی ایسا کام آجائے کہ جس کی وجہ سے وہ نیکی نہ کر سکو۔

مسافر کیلئے فرصت کا استعمال اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ جب آپ سفر کیلئے روانہ ہوں تو اب آپ کی اوقات نماز کے اندر تبدیلی ہو جائے گی، گھر پر رہ کر نماز کے جو اوقات تھے ان میں تھوڑا سا فرق آجائے گا۔ جب آپ گھر پر تھے تو یہ حکم تھا کہ گرمیوں کے زمانے میں ظہر کی نماز ٹھنڈا کر کے پڑھو۔ فرض کر لیجئے کہ اگر ظہر کا وقت تین گھنٹے تک رہتا ہے تو ڈیڑھ دو گھنٹے گذر جانے کے بعد جب وقت ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو

(۱) بخاری شریف۔ کتاب الرقاق / ۵۹۳۳۔ سنن ترمذی، کتاب الزھد / ۲۲۲۶۔ سنن ابن ماجہ کتاب الزھد / ۴۱۶۰

پڑھو۔ (۱) اسی طریقہ سے اگر فجر کا وقت ہے تو اتنا سویرا ہو جائے کہ لوگوں کو گھر سے آنے میں دشواری نہ ہو۔ لیکن فرمایا کہ دو حالتوں کے اندر اتنی جلدی کرنا چاہئے کہ جیسے ہی وقت شروع ہو فوراً نماز ادا کرلو۔ ایک سفر کی حالت میں اور ایک بیماری کی حالت میں، اگر تم حالت سفر میں ہو تو جیسے ہی ظہر کا وقت شروع ہو فوراً نماز ظہر ادا کرلو، جیسے ہی فجر کا وقت شروع ہو تاخیر کئے بغیر اندھیرے میں ہی نماز فجر ادا کرلو۔ اسی طرح بیمار آدمی کو بھی جلدی کرنی چاہئے، وجہ یہ ہے کہ مسافر کو یہ نہیں معلوم کہ اگلی منزل جو آنے والی ہے اس میں ایسا موقع ملے گا یا نہیں، نماز ادا کر سکیں گے یا نہیں، اس لئے یہ جو پہلا وقت مل گیا اس کو غنیمت جانو اور اس پہلے وقت میں ہی نماز ادا کرلو۔

مریض کیلئے فرصت کا استعمال

یہی حالت بیمار آدمی کی بھی ہے کہ اگر اس وقت اللہ نے تمہیں موقعہ دیا ہے تو فوراً نماز پڑھ لو اس لئے کہ ممکن ہے کہ پندرہ (۱۵) بیس (۲۰) منٹ کے بعد خدا نہ کرے کوئی درد کھڑا ہو جائے یا کوئی دورہ پڑ جائے یا بیماری بڑھ جائے تو شاید اتنی بھی مہلت نہ ملے کہ تم نماز پڑھ سکو۔ اس لئے فقہاء نے فرمایا کہ مسافر اور مریض کو یہ چاہئے کہ وقت شروع ہوتے ہی جب بھی نماز کا موقعہ ملے نماز پڑھ لے۔

بہر حال! صحت و تندرستی خدا کی ایک نعمت ہے لیکن فرض کر لیجئے کہ اگر انسان صحت و تندرستی کو گناہ اور معصیت کے اندر خرچ کر رہا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ اس میں جو خیر کا پہلو تھا وہ اس سے الگ ہو گیا اور شر کا پہلو اس کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔

جاہ و منصب میں خیر اور شر کا پہلو

اسی طریقہ سے اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو اقتدار و کرسی، عزت و وقار اور سر بلندی عطا فرمائی ہے اگر وہ اس سے کوئی نیک کام میں مدد لیتا ہے، دین کی کوئی خدمت کرتا ہے تو وہ اس کیلئے نعمت ہے، خیر ہے۔ اور اگر

(۱) بخاری شریف باب مواقیت الصلوٰۃ ۱ر ۵۰

اس کے ذریعہ انسان دوسروں کے حقوق تلف کرتا ہے۔ دوسروں کے اوپر ظلم کرتا ہے تو وہ اس کیلئے شر ہے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں بڑی اچھی بات کہی ہے۔ فارسی میں انکا ایک شعر ہے۔ جس میں وہ یہ فرماتے ہیں کہ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے تھانیدار نہیں بنایا۔ اس لئے کہ اگر وہ مجھے تھانیدار بنادیتا تو پتہ نہیں میں کس کس کے اوپر ظلم کرتا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے میرے ہاتھ میں اقتدار ہی نہیں دیا کہ میں کسی پر ظلم کرسکوں۔ فرمایا کہ ؎

کُجا خود شکر ایں نعمت گذارم

کہ زورِ مَردُم آزاری نہ دارم

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مال و دولت کے دلدادہ نہیں تھے

تو میرے دوستو! میں یہ عرض کررہا تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے اللہ! میرے دل میں مال کی اتنی محبت ضرور ہے جتنی کہ تو نے میرے خون میں ڈالدی ہے لیکن اے اللہ! میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اس مال کے شر سے میری حفاظت فرماکر اس میں خیر کا جو پہلو ہے وہ میرے ساتھ وابستہ فرما۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ دعا فرمائی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں مال کی محبت بالکل نہیں تھی۔ اس لئے نہیں تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے۔ اور آپ کا مال دولت کے ساتھ جو تعلق تھا اسے آپ لوگ بخوبی جانتے ہیں۔ ان چیزوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی سخت نفرت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مال و دولت سے، دنیا سے محبت نہیں تھی۔

اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت و حکومت تقریباً دس سال رہی، اور حکومت بھی اتنی بڑی تھی کہ اگر ہندوستان

دپاکستان دونوں ایک ہوجائیں تواس سے بھی آٹھ گنا بڑی ان کی حکومت تھی، یعنی دنیا کے تقریباً آدھے حصے پر ان کی حکومت تھی اور دس سال حکومت کرنے کے بعد جب ان کی شہادت ہوئی اور دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کا ہاتھ بالکل خالی تھا۔

حضرت عمر کی شہادت اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ جس دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اس کے اگلے دن کسی نے ان کے لڑکے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ کہدیا کہ جس خنجر سے آپ کے باپ کو شہید کیا گیا ہے اس خنجر کو میں نے فلاں آدمی کے پاس رکھا دیکھا تھا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو جوش آگیا اور تلوار لیکر گئے اور اس آدمی کی گردن اڑادی۔

اسلامی قانون کی بالا دستی حضرت عبد اللہ امیر المؤمنین کے بیٹے ہیں لیکن بہر حال! یہ ان کی غلطی تھی اور ان کا مرتبہ قانون سے زیادہ بڑا نہیں تھا، امیر المؤمنین کے بیٹے ہوئے تو کیا ہوا امیر المؤمنین کا مرتبہ بھی قانون سے بڑا نہیں ہے۔ قانون کی عزت اور قانون کا وقار بالا ہے اور امیر المؤمنین کا مرتبہ اس سے نیچے ہے۔ اسلام کی عدالت نے صرف سبق نہیں دیا بلکہ واقعات وحقائق کے ذریعہ ہمیں یہ بتلادیا کہ امیر المؤمنین خواہ کتنا ہی بڑا درجہ رکھتے ہوں لیکن ان کو بھی قانون کا پابند ہو کر چلنا پڑے گا

امیر المؤمنین اور اسلامی قانون مثال کے طور پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ امیر المؤمنین ہیں، ایک یہودی زرہ لیکر جارہا تھا، حضرت امیر المؤمنین نے کہدیا کہ یہ زرہ جو تمہارے پاس ہے وہ میری ہے۔ یہودی نے کہا یہ زرہ آپ کی نہیں میری ہے، آپ کے کہنے کے مطابق اگر یہ زرہ آپ کی ہے تو عدالت میں جاکر دعویٰ دائر کیجئے، آپ امیر المؤمنین ہیں تو ہوا کریں باتی، اگر کوئی چیز مجھ سے آپ لے سکتے ہیں تو قانون کے دائرے کے اندر ہی لے سکتے ہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ عدالت میں گئے اور حاکم

قاضی شُریح کے پاس جو قاضی القضاۃ تھے دعویٰ دائر کردیا۔ قاضی القضاۃ کا ترجمہ ہے چیف جسٹس (CHIEF JUSTICE) سپریم کورٹ (SUPREME COURT) اعلیٰ عدالت کا جج۔

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ قاضی شُریح کی عدالت میں

امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ جب مقدمہ لیکر گئے تو قاضی شُریح نے کہا کہ آپ جو یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ یہ ذرہ میری ہے تو اس دعویٰ کیلئے آپ کے پاس شہادتیں ہیں یا نہیں ؟ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ہاں! میرے پاس شہادتیں ہیں، اسلام میں دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ میرے پاس بھی دو گواہ ہیں، ایک میرے بیٹے حسن ہیں اور دوسرے میرے آزاد کردہ ایک غلام ہیں! قاضی شُریح نے فرمایا کہ آپ کے آزاد کردہ غلام کی شہادت تو قابلِ قبول ہے اس لئے کہ آپ نے اسے آزاد کردیا ہے اور اب آپ کے ساتھ اسکا کوئی تعلق نہیں رہا لیکن آپ کے بیٹے حسن کی شہادت اصول اور ضابطے کے لحاظ سے قبول نہیں کی جاسکتی ہے کیونکہ وہ آپ کے بیٹے ہیں اور بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں معتبر نہیں ہے لہذا آپ ان کے علاوہ کوئی دوسرا گواہ لایئے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صداقت

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی شہادت کو ناقابل وقبول قرار دینے سے نعوذ باللہ قاضی شُریح کا مطلب یہ نہیں تھا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنے قول میں ناقابلِ اعتبار ہیں، بلکہ اگر خود قاضی شُریح سے یہ پوچھا جاتا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صداقت اور انکی سچائی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو وہ یہی فرماتے کہ ساری ملت کی سچائی ایک طرف رکھ دی جائے تو اس کے مقابلہ میں تنہا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی سچائی رکھی جاسکتی ہے لیکن چونکہ ایک ضابطہ اور اصول ہے کہ بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں معتبر نہیں ہے اور یہ اصول سب کیلئے

یکساں ہے خواہ وہ امیر المؤمنین ہوں یا ایک ادنیٰ سا آدمی ہو۔اس لئے قاضی شریح نے فرمایا کہ آپ کے بیٹے کی شہادت معتبر نہیں ہے اس لئے دوسرے گواہ کو پیش کیجئے۔

قاضی شُریح کا فیصلہ حضرت امیر المؤمنین نے فرمایا کہ میرے پاس سوائے ان دونوں گواہوں کے اور کوئی گواہ نہیں ہے۔ قاضی شریح نے کہا کہ اگر آپ کوئی دوسری شہادت نہیں پیش کر سکتے تو میں آپ کے مقدمہ کو خارج کرتا ہوں۔ آپ ذرہ لینے کے حقدار نہیں ہیں، ذرہ اسی یہودی کی ہے۔ عدالت سے امیر المؤمنین کا مقدمہ خارج ہو گیا۔ حضرت امیر المؤمنین اور وہ یہودی دونوں کمرہ عدالت سے باہر آگئے۔

یہودی مسلمان ہو گیا اب یہودی اپنے دل میں یہ کہہ رہا ہے کہ ذرہ تو دراصل امیر المؤمنین ہی کی ہے، اور میں نے دینے سے اس لئے انکار کیا کہ یہ لوگ اپنے دین کے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا دین اللہ کا دین ہے لہذا میں ان لوگوں کا انصاف دیکھنا چاہتا تھا کہ واقعتاً یہ دین اللہ کا دین ہے، یا نہیں؟ اگر یہ دین اللہ کا دین ہے تو اسکے اندر ہر ایک کیلئے عدل وانصاف ہو گا۔ آج میں نے دیکھ لیا کہ واقعتاً اس قوم کے اندر عدل وانصاف ہے۔ اور ان کا امیر المؤمنین بھی قانون اور ضابطہ سے بالاتر نہیں ہے۔ یہ سوچ کر وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس آیا اور انکا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا کہ لیجئے! یہ ذرہ آپ ہی کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسکی زبان پر یہ کلمہ جاری ہو گیا،

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمدا الرّسول اللہ وہ مسلمان ہو گیا۔(۱)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، عثمان غنیؓ کی عدالت میں تو میرے عرض کرنے کا منشاء یہ ہے کہ جب امیر المؤمنین بھی ضابطہ اور قانون سے باہر نہیں جا سکتے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کیسے ضابطہ اور

(۱) تاریخ الخلفاء للسیوطی/۲۰۱

قانون سے بالاتر ہو سکتے ہیں؟ ان کا مقدمہ بھی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اور جب یہ مقدمہ عدالت میں آیا اس وقت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو خلافت کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تقریباً دوسرا یا تیسرا دن تھا۔ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی عدالت میں سب سے پہلے جو مقدمہ آیا وہ یہی (سابق امیر المومنین کے بیٹے کا) مقدمہ تھا۔ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کے لئے جو بڑی بڑی مشکلات پیدا ہوئیں ان کے اسباب میں سے یہ مقدمہ بھی ایک سبب تھا جو ان کیلئے مصیبت بن گیا تھا۔

اسلام میں قتل عمد کا حکم بہر حال! حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی عدالت میں سابق امیر المؤمنین کے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا مقدمہ آیا اور یہ مقدمہ "قتلِ عمد" کا مقدمہ تھا، اور اس سلسلہ میں شریعت کا اصول یہ ہے کہ اگر مقتول کے ورثاء یہ کہیں کہ صاحب! جسکو مرنا تھا وہ بیچارہ تو مر گیا، اب ہم اس کے بدلے میں کسی کی جان لیکر کیا کریں، اگر اس کے بدلے میں ہمیں مال اور فدیہ دے دیا جائے جسکو "خون بہا" کہتے ہیں تو ہم راضی ہیں تو عدالت عالیہ یہ فیصلہ دیدے گی کہ مقتول کے ورثاء کو "خون بہا" دیدیا جائے اور قاتل کو چھوڑ دیا جائے۔ لیکن اگر مقتول کے ورثاء یہ کہیں کہ نہیں صاحب! ہم پیسہ اور "خون بہا" نہیں لیتے ہمیں تو جان کے بدلہ میں جان چاہئے تو عدالت کیلئے اسکو قصاصاً قتل کرنے اور پھانسی دینے کا فیصلہ کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی عدالت میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا جرم ثابت ہو گیا تو انہوں نے ضابطہ کے مطابق مقتول کے ورثاء سے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ قصاص یا فدیہ؟ کیونکہ یہ بات تو ثابت ہو گئی ہے کہ انہوں نے قتل کیا ہے لہذا اب جیسا تمہارا مطالبہ ہو گا ویسا ہی ان کے ساتھ برتاؤ کیا جائے گا۔ بعض مسلمان آپس میں مقتول کے ورثاء سے یہ

کہنے لگے کہ بھائی! ذرا سوچو اور غور کرو کہ ادھر امیر المؤمنین کا انتقال ہوا ہے جنہوں نے دس سال اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی ہے اور ابھی تین دن بھی نہیں گذرے کہ آج ان کے بیٹے کو پھانسی دے رہے ہو؟ قتل کر رہے ہو؟ مگر یہاں سوال امیر المؤمنین کے بیٹے کا نہیں تھا، سوال ضابطہ اور اصول کا تھا۔ اور اصول کے اندر مقتول کے ورثاء کی خواہش کا اعتبار کیا گیا ہے۔ لہذا جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ قصاص یا فدیہ؟ تو انہوں نے یہ کہا کہ ہمیں جان کے بدلے جان نہیں چاہئے بلکہ جان کے بدلہ میں فدیہ اور مال چاہئے۔ کیونکہ اگر کچھ معاوضہ مل جائے گا تو اس مقتول کے بیوی بچوں کا بھی گذارہ ہو جائے گا۔ لہذا ہمیں "خون بہا" دیدیا جائے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مالی حالت میں نے یہ واقعہ اس لئے سنایا کہ آگے جو بات آرہی ہے وہ سننے کے قابل ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کردیا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مقتول کے وارثین کو فدیہ کی رقم ادا کردیں اور عدالت ان کو بری کرتی ہے۔ اب آپ لوگ اندازہ لگایئے کہ جس شخص نے تقریباً دس سال تک اتنی بڑی حکومت چلائی ہے اور ابھی ان کو شہید ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا ہے۔ مگر آج ان کے بیٹے کے پاس اپنی جان بچانے کیلئے اتنی رقم بھی موجود نہیں ہے کہ وہ خون بہا اور فدیہ کی رقم ادا کریں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی فراخ دلی اور جب ان کے پاس پیسہ نہیں تھا تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جو بہت بڑے مالدار اور تاجر تھے نے فرمایا کہ چونکہ یہ امیر المؤمنین کے بیٹے ہیں اور ان کے باپ صرف امیر المؤمنین ہی نہیں تھے بلکہ ان کے اندر ایسی صلاحیتیں تھیں کہ ان کے بارے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی تو میرے بعد عمر فاروق رضی اللہ عنہ نبی ہوتے۔ (۱) یہ کہہ کر

(۱) سنن ترمذی باب المناقب / ۳۶۱۹، مسند الشامیین / ۱۶۷۶۳

عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنی جیب سے فدیہ کی رقم نکالی اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف سے مقتول کے وارثوں کو ادا کر دیا۔

اسی وجہ سے بعد میں چل کر یہ واقعہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی مشکلات اور دشواریوں کے اسباب میں سے ایک سبب بن گیا۔ لوگ کہنے لگے کہ انہوں نے امیر المؤمنین کے بیٹے کی حمایت کی ہے اور اپنی جیب سے رقم نکال کر انہوں نے دی ہے حالانکہ یہ شرع کے خلاف نہیں تھا، ضابطہ اور اصول کے خلاف نہیں تھا، اس لئے کہ جب مقتول کے وارثین یہ کہہ دیں کہ ہم خون بہا اور فدیہ چاہتے ہیں اور قاتل کے پاس فدیہ ادا کرنے کیلئے پیسے نہ ہوں تو پھر اگر جج (JUDGE) خود اپنی جیب سے اسکی مالی امداد کر دے تو یہ اصول وضوابط کی خلاف ورزی نہیں ہے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے چونکہ یہ دیکھا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں مال ودولت کی محبت قطعاً نہیں ہے اس لئے ان کے دل میں بھی مال کی محبت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دس سال حکومت کرنے کے باوجود انتقال کے وقت ان کا ہاتھ خالی تھا۔

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت سے بے اعتنائی

حدیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک فرشتہ آیا اور یہ عرض کیا کہ یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو اس اُحد کے پہاڑ کو سونے کا پہاڑ بنا دیا جائے اور صرف یہی نہیں کہ اس کو سونے کا پہاڑ بنا دیا جائے بلکہ آپ (جہاں کہیں بھی جائیں تو یہ پہاڑ آپ کے ساتھ ساتھ چلے تاکہ آپ کی ضروریات پوری ہو سکیں۔(۱) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں دنیا میں سونے اور چاندی جمع کرنے کیلئے نہیں آیا ہوں، میں تو اس لئے آیا ہوں کہ ایک وقت کھانا

(۱) بخاری کتاب الرقاق

کھاؤں اور دوسرے وقت فاقہ کروں تاکہ میری امت اس سے سبق حاصل کرے۔

قرآن کریم کی عملی تفسیر اب آپ اندازہ لگایئے کہ جنہوں نے حضور اکرم ﷺ کا یہ طریقہ اور یہ طرزِ زندگی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور آپ ﷺ ہی کی تربیت میں رہے ہیں اُن کے دل میں مال کی محبت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور صرف یہی نہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے دل میں مال کی محبت نہیں تھی بلکہ قرآن کریم کے جتنے بھی احکام ہیں اور جتنے آیات قرآن کریم کے نازل ہوئے۔ ان پر سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے عمل کیا اور اس طریقہ پر عمل کیا کہ اگر قرآن کریم کے الفاظ اور رسول اللہؐ کے عمل دونوں کو سامنے رکھے گا تو معلوم ہو گا کہ یہ الفاظ قرآن ہیں اور یہ اس کے معنی ہیں، اس طریقہ پر رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم کے ہر ہر حکم پر عمل کیا ہے۔

حکم زکوٰۃ پر کبھی عمل کی نوبت نہیں آئی لیکن قرآن کریم کا ایک حکم ایسا بھی ہے کہ جس پر حضور اکرم ﷺ کو پوری زندگی میں عمل کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اور وہ حکم بھی ایسا اہم حکم ہے کہ اگر جان بوجھ کر اسکو چھوڑ دیا جائے اور ترک کر دیا جائے تو ترک کرنے والوں کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ کونسا حکم ہے؟ وہ زکوٰۃ کا حکم ہے! آپ ﷺ نے نماز کے فریضے کو ادا کیا، روزے کے فریضے کو ادا کیا، حج کے فریضہ کو ادا کیا اور جہاد کے فریضہ کو ادا کیا لیکن ساری زندگی اور پوری عمر میں زکوٰۃ کے فریضہ کو ادا کرنے کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی۔ اور نوبت کہاں سے آتی؟ اس لئے کہ زکوٰۃ تو اس وقت واجب ہوتی ہے جبکہ کسی پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا جمع ہو اور جمع ہونے پر بھی سال گذر چکا ہو۔ جبکہ حضور اکرم ﷺ نے ساڑھے باون تولہ چاندی تو درکنار ساڑھے باون پیسہ بھی کبھی جمع نہیں فرمایا، ساڑھے سات تولہ سونا درکنار ساڑھے سات روپیہ بھی کبھی آپ ﷺ نے جمع نہیں کیا۔ اور جب آپ ﷺ نے پوری زندگی کبھی کوئی رقم اپنے پاس جمع

نہیں فرمائی تو زکوۃ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہاں؛ حضور اکرم ﷺ زکوٰۃ ادا کرتے تھے لیکن وہ زکوۃ ہماری اور آپ کی زکوٰۃ سے الگ ہوتی تھی۔

حضرت جنید بغدادیؒ کا سجدۂ عشق حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمۃ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت؛ سجدہ کے کیا شرائط ہیں؟ انہوں نے فوراً پوچھا کہ کس کا سجدہ؟ تمہارا یا ہمارا؟ اس نے کہا، جی حضور؛ سجدہ تو سب کا برابر ہے، آپ بھی مسلمان ہیں، میں بھی مسلمان ہوں، پھر ہمارا سجدہ الگ الگ کیسے ہو سکتا ہے؟ فرمایا کہ نہیں؛ تمہارا سجدہ اور ہے، ہمارا سجدہ اور ہے، تمہارا سجدہ یہ ہے کہ ناک کا نرم حصہ اور پیشانی زمین پر ٹک جائے تو سمجھو کہ تمہارا سجدہ پورا ہو گیا۔ لیکن فرمایا کہ ہم فقیروں کا سجدہ یہ ہے کہ جب ایک مرتبہ اللہ کی بارگاہ میں سر جھک جائے تو جب تک جسم سے جان نہ نکل جائے اس وقت تک سر اوپر نہ اٹھائیں۔ یہ ہمارا سجدہ ہے اور ہمارے اور تمہارے سجدے میں یہی فرق ہے۔ فرمایا کہ ؎

آں سجدہ کہ سر زتن نمی شود جدا
در کشور وفا گنا ہش نام کردہ اند

ہم ایسے سجدے کو گناہ سمجھتے ہیں کہ جس میں انسان اپنا سر تو اللہ کے سامنے جھکا دیتا ہے لیکن اپنی جان اللہ کی خدمت میں پیش نہیں کرتا۔

حضور اکرم ﷺ کی زکوٰۃ یہی حال زکوٰۃ کا ہے، ہماری اور آپ کی زکوۃ الگ ہے اور رسول اللہ ﷺ کی زکوٰۃ الگ ہے۔ ہماری اور آپ کی زکوٰۃ یہ ہے کہ ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا جمع ہو جائے اور اس پر سال گذر جائے اور وہ بھی اپنی ضروریات اصلیہ سے فارغ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ ضروریات سے فارغ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے پاس ساڑھے سات تولہ سونا بھی ہے اور

کچھ قرضہ بھی آپ کے اوپر ہے۔اب اگر آپ قرضہ اتارنے کیلئے آئیں تو پھر آپ کے پاس ساڑھے سات تولہ سونا نہیں بچے گا بلکہ اس سے کم رہ جائے گا۔ تو آپ کے اوپر زکوۃ واجب نہیں ہے۔ بلکہ اصلی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد اگر ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی بچے یا اس کے بقدر کوئی دوسرا مال ہے تو سال بھر گذرنے کے بعد ہم اور آپ زکوۃ ادا کرتے ہیں۔ لیکن حضور اکرم ﷺ کی زکوۃ یہ تھی کہ اگر آپ کے پاس ایک تولہ سونا یا چاندی بھی کہیں سے آجاتا تو اس سونے یا چاندی پر رسول اللہ ﷺ کے گھر میں ایک رات بھی نہیں گذر پاتی تھی کہ آپ ﷺ انہیں فقراء اور مساکین پر تقسیم فرمادیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ رسول کے اوپر ایک رات بھی ایسی نہیں گذرنی چاہئے کہ ان کے گھر میں سونا اور چاندی رکھے ہوئے ہوں، تو جب حضور اکرم ﷺ کی زکوۃ یہ تھی تو وہاں ضابطہ کی زکوۃ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مسلمان بحیثیت قوم مالدار کیوں نہیں؟ اس سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے دل میں مال کی محبت نام کیلئے بھی نہیں تھی، ورنہ اگر آپ کے دل میں مال کی محبت ہوتی تو زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور آپ ﷺ کے پاس جمع رہتا، مگر آپ ﷺ نے کبھی کچھ نہیں جمع فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اٹھا کر آپ دیکھ لیجئے، مسلمانوں کے اوپر دنیا میں چودہ سو سال گذر گئے ہیں، چودہ صدیاں گذر گئی ہیں لیکن تاریخ میں آپ ایک صدی بھی ایسی نکال کر نہیں دکھا سکتے کہ جس میں مسلمان بحیثیتِ قوم، اقوامِ عالم میں سب سے زیادہ مالدار قوم رہی ہو، بنیوں کی طرح، یہودی قوم کی طرح دنیا میں سب سے زیادہ مالدار قوم مسلمان کبھی نہیں رہے۔

عشق رسول کا غلبہ جسکا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول کی جو محبت ہے اُسکی وجہ سے ان کے دلوں میں مال کی اتنی محبت کبھی پیدا ہوہی

نہیں سکتی ہے کہ یہ دنیا کی سب سے مالدار قوم بن جائے۔ بلکہ اگر مسلمانوں کے پاس قومی حیثیت سے اگر کوئی خزانہ تھا تو وہ علم کا خزانہ تھا، اخلاق کا خزانہ تھا، تقویٰ اور نیکی کا خزانہ تھا لیکن سونے اور چاندی کا خزانہ مسلمانوں کے پاس کبھی نہیں تھا۔ دنیا کے آدھے حصے پر مسلمانوں نے حکومت و سلطنت کی لیکن اس وقت بھی مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم نہیں تھی۔ حالانکہ بہت سی قومیں حکومت و سلطنت کی وساطت اور اس کے ذریعہ سے دولت اور سرمایہ جمع کر کے مالدار ہوئی ہیں۔ تقریباً پانچ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک مسلسل اور متواتر مسلمانوں کی حکومت رہی ہے مگر اس کے باوجود انکے دور حکومت میں ساری قوم مالدار ہو گئی ہو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ بلکہ مال و دولت کے اعتبار سے ہمیشہ مسلمانوں کی حیثیت کمزور رہی ہے جبکہ دوسری قوموں کے پاس مال و متاع اور ساز و سامان ہمیشہ سے زیادہ رہا ہے۔

یہود کا مطمح نظر مثلاً یہود قوم کو لے لیجئے، صرف ان کی سو سال کی تاریخ آپ کو یہ بتلائے گی کہ ہمیشہ ان کے پاس مال و دولت زیادہ رہی ہے، اور یہ قوم دنیا میں سب سے زیادہ مالدار قوم رہی ہے۔ قرآن کریم نے بھی ان کی مالداری کا ذکر کیا ہے۔ جب حضور اکرم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے اس وقت بھی ان لوگوں کا سودی کاروبار چلتا تھا اور یہ لوگ سود کے اوپر لوگوں کو روپیہ دیا کرتے تھے۔ لیکن جب حضور اکرم ﷺ نے سود کی حرمت کا اعلان کیا تو ان کا یہ کاروبار ختم ہو گیا اور جو غرباء ان کی پنجوں کے اندر دبے ہوئے تھے وہ سب کے سب آزاد ہو گئے۔

فطری محبت، مگر کس حد تک؟ تو خیر بات یہاں سے چلی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سی چیزوں کی محبت ہمارے دلوں میں ڈال دی ہے۔ جن میں سے اولاد کی محبت ہے، ماں باپ کی محبت ہے، مال و جائداد کی محبت ہے۔ حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی محبت ہم نے تمہارے دلوں میں پیدا کر دی ہے

اور یہ ہماری حکمت کا تقاضہ ہے۔ اس لئے کہ اگر ہم ان چیزوں کی محبت تمہارے دلوں میں پیدا نہ کرتے تو تم ان کے حقوق ادا نہیں کر پاتے۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھو! وہ یہ کہ ان سب چیزوں کی محبت کوئی عیب نہیں ہے۔ کوئی جرم نہیں ہے۔ شوق سے کرو۔ اگر تم ماں باپ ہو تو بے شک اپنی اولاد سے محبت کرو۔ لیکن خبردار! اولاد سے ایسی محبت ہرگز نہ کرنا کہ اس کی وجہ سے اللہ کو بھی بھلا دو۔ اللہ کے رسول کو بھلا دو۔ یعنی اولاد کی محبت کو اللہ اور اس کے رسول کی محبت پر غالب نہ ہونے دینا۔ اگر تم نے ایسا کیا کہ اولاد کی محبت کو غالب کر دیا اللہ اور اس کے رسول کی محبت پر۔ تو تم خدا کی نظر میں عذاب کے مستحق ہو جاؤ گے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے ماں باپ کا واقعہ بیان فرمایا ہے جنکے دلوں میں اولاد کی محبت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس کی وجہ سے خدا اور خدا کے رسول کی محبت کم ہو جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔

حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کا واقعہ

حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا واقعہ آپ کو یاد ہو گا۔ قرآن کریم کے پندرہویں پارہ کے آخر میں اور سولہویں پارہ کے شروع میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ پورا واقعہ تو بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ مختصراً یہ کہ حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام سفر میں چلے جا رہے ہیں۔ دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک کشتی جا رہی ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام براہ راست خدا کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بغل میں شریعت کی کتاب ہے جس میں جائز و ناجائز کے احکام لکھے ہوئے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام آگے بڑھے اور کشتی پر جا کر اس کا ایک تختہ نکال دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذہن میں فوراً یہ بات آئی کہ یہ تو جائز نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا

آپ نے یہ کام اچھا نہیں کیا، یہ جائز نہیں ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا۔

اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا

فرمایا کہ میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ میرے کاموں کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔ دیکھئے! پھر وہی کیا نا آپ نے؟ فرمایا کہ اچھا معاف کیجئے! میں بھول گیا تھا، اب میں دخل نہیں دوں گا!

قرآن کریم نے کہا کہ یہ دونوں پھر آگے کو چلے، دیکھا کہ گلی میں ایک نہایت حسین و جمیل اور معصوم بچہ کھیل رہا ہے، حضرت خضر علیہ السلام آگے بڑھے اور اس بچہ کو ایسا مارا کہ وہ ہلاک ہو گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام بے چین ہو گئے، تڑپ گئے اور فرمایا کہ۔

قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا

یہ آپ نے کیا کیا؟ ایک بے قصور بچے کو آپ نے قتل کر دیا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ اعتراض کیا تو حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ دیکھئے! میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ میری باتوں پر صبر نہیں کر سکیں گے۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا

جو میں نے کہا تھا اب وہ سامنے آگیا لہٰذا اب ہم اور آپ جدا ہو جائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اچھا! دو موقع آپ نے دیئے اور ان دونوں موقعوں پر واقعی میں خاموش نہیں رہ سکا، اب ایک اور موقعہ مجھے دے دیجئے! میں کوشش کروں گا کہ اب میں آپ پر کوئی اعتراض نہ کروں۔

قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِىْ
قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّىْ عُذْرًا

اگر اس کے بعد کوئی اعتراض کروں گا تو آپ بے شک مجھے الگ کر دیجئے گا۔

چنانچہ حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام پھر آگے چلے۔ فرمایا کہ۔

فَانْطَلَقَا حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ ۨاسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ

ایک بستی کے اندر پہنچے، اس بستی میں انہیں کوئی نہیں جانتا تھا، ان کے پاس کھانے پینے کا سامان بھی نہیں تھا اس لئے انہوں نے چاہا کہ اگر کوئی مزدوری کا کام مل جائے تو مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھر لیں۔ اسی تلاش و جستجو میں تھے کہ دیکھا ایک مکان کی دیوار گرنے کے قریب ہو رہی ہے حضرت خضر علیہ السلام آگے بڑھے اور اس دیوار کو اپنے کندھے کے سہارے درست کر دیا، برابر کر دیا۔

اعتراض میں بھی لطافت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ خیال تھا کہ اب اگر میں اعتراض کیا تو جدائیگی ہو جائے گی، اس لئے انہوں نے اعتراض کے انداز میں تو کچھ نہیں کہا، البتہ صرف اتنا کہا کہ اگر دیوار ٹھیک کرنے کا یہی کام ہم دونوں مل کر اجرت و مزدوری کے اوپر کر لیتے تو ہمارے گذارے کا سامان بھی ہو جاتا، ہمارے کھانے پینے کا انتظام بھی ہو جاتا۔ فرمایا کہ۔

قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعتراض نہیں ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی اعتراض ہے، بعض اوقات اعتراض کرنے کے طریقے الگ الگ ہوتے ہیں۔

ایک نوشہ کا دلچسپ واقعہ ایک صاحب کی شادی ہو رہی تھی، انہوں نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ بھائی میری شادی ہو رہی ہے، میرے پاس دوشالہ نہیں ہے اور تمہارے پاس بڑا قیمتی دوشالہ ہے، جب میں نوشہ بن کر شادی کرنے جاؤنگا تو تم اپنا دوشالہ دے دینا؟ اس نے کہا، شوق سے لے جایئے گا! چنانچہ یہ صاحب نوشہ بنے ہوئے دوشالہ اوڑھ کر شادی کرنے کیلئے چلے۔ راستہ میں ایک بستی پر گذر ہوا تو لوگوں نے پوچھا کہ بھائی! نوشہ کہاں ہے؟ تو جن صاحب کا دوشالہ تھا وہ فرمانے لگے کہ

صاحب! نوشہ تو یہ ہیں، باقی دوشالہ میرا ہے! نوشاہ صاحب کو بڑا غصہ آیا، دوشالہ اتار کر پھینکنے لگے اور کہا کہ بھائی! کیا تم نے مجھے ذلیل کرنے کیلئے یہ دوشالہ دیا تھا؟ وہ صاحب معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے، اب میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی سے یہ نہیں کہوں گا کہ دوشالہ میرا ہے، پھر آگے چلے تو ایک بستی میں پھر یہی سوال ہوا کہ نوشہ کہاں ہے؟ تو آپ فرمانے لگے کہ نوشہ صاحب تو یہ ہیں لیکن دوشالہ کے بارے میں میں کچھ نہیں کہنا چاہتا! لوگ سمجھ گئے کہ دوشالہ میں دال میں کالا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ انکا نہیں ہے۔ نوشہ صاحب پھر ناراض ہوئے تو یہ صاحب کہنے لگے کہ اچھا بھائی! اگر تم اس پر بھی ناراض ہوتے ہو تو آئندہ یہ بھی نہیں کہوں گا! چنانچہ آگے بڑھے، پھر کسی بستی کے اندر یہ سوال ہوا کہ نوشہ صاحب کہاں ہیں؟ تو یہ صاحب فرمانے لگے کہ یہ ہیں نوشہ صاحب اور دوشالہ بھی انہیں کا ہے۔ نوشہ صاحب ہی کا ہے۔

اب آپ اندازہ لگائیے کہ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ دوشالہ میرا ہے بلکہ یہ کہا کہ میں دوشالہ کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا، پھر یہ کہا کہ دوشالہ بھی انہیں کا ہے، جسکا مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی بات ایک ہی ہوتی ہے لیکن کہنے کا طریقہ الگ الگ ہوتا ہے۔

اس واقعہ میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا کہ "یہی کام اگر اجرت ومزدوری پر کرلیتے تو ہمارے گذارے کا سامان بھی ہوجاتا" بظاہر تو اعتراض نہیں معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض ہے، اس لئے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ۔ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ

اب ہم اور آپ دونوں جدا ہوجائیں، اب ہم دونوں کا ساتھ رہنا ممکن نہیں ہے۔

دل کی صفائی لیکن ہماری جدائی رنجش کے ساتھ نہیں ہونی چاہیے بلکہ دوستانہ

فضاء، اور اچھے جذبات کے ساتھ ہونی چاہئے، اس لئے جدا ہونے سے پہلے میں نے جو کچھ کیا ہے اور جس کے بارے میں آپ نے تین مرتبہ مجھے ٹوکا ہے اس کے متعلق خدا کی حکمت کی بات بتاتا چلوں تاکہ بات آپ کی سمجھ میں آجائے کہ میں نے کشتی کیوں توڑی تھی؟ بچہ کو کیوں قتل کیا تھا؟ اور دیوار کیوں سیدھی کی تھی؟ اس لئے کہ جب کوئی بات کسی انسان کے سمجھ میں نہیں آتی ہے تو اس کی وجہ سے اس کے دل میں بدگمانی اور خلش پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی لئے ہر مسلمان کو چاہئے کہ جب کبھی اس کے طرف سے کسی کے اندر بدگمانی پیدا ہوجائے تو فوراً اس کو دور کردے۔

سوء ظن سے بچنے کی نادر مثال حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ مسجد کے اندر اعتکاف میں تھے، آپ ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے ایک بیوی جو غالباً حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ آپ سے کوئی بات کرنے کیلئے تشریف لائیں۔ آپ ﷺ ان سے گفتگو فرمارہے تھے اندھیرے کا وقت تھا، اور تنہائی تھی۔ آپ ﷺ ان سے گفتگو میں مشغول تھے کہ بعض صحابہ کا وہاں سے گذر ہوا، وہ آپ ﷺ کو دیکھ کر آگے بڑھ گئے۔ فوراً حضور اکرم ﷺ نے ان کو بلایا اور فرمایا کہ یہ خاتون جن سے میں گفتگو کررہا ہوں میری فلاں بیوی ہیں؛ صحابی نے عرض کیا، یارسول اللہ! آپ کو یہ فرمانے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔

اتقوا مواضع التهم (۱)

آپ ﷺ نے فرمایا کہ تہمت کی جگہ سے انسان کو بچنا چاہئے۔ یعنی اگر اس قسم کا واہمہ اور اس قسم کا خیال کسی کے دل میں پیدا ہوسکتا ہو تو فوراً اس کی صفائی کردینی چاہئے۔

حضرت خضر علیہ السلام کی صفائی اسی طریقہ سے حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت

(۱) (بخاری شریف باب هل یخرج المعتکف لحوائجه الی باب المسجد)

موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ اب ہم اور آپ جدا ہو رہے ہیں تو اچھے اور دوستانہ ماحول میں جدا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ نے جو جو اعتراضات کئے ہیں میں ان کا جواب آپ کو دے دوں۔ اور وہ جواب یہ ہے فرمایا کہ۔

اَمَّا السَّفِیۡنَۃُ فَکَانَتۡ لِمَسٰکِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ فِی الۡبَحۡرِ فَاَرَدۡتُّ اَنۡ اَعِیۡبَہَا وَ کَانَ وَرَآءَہُمۡ مَّلِکٌ یَّاۡخُذُ کُلَّ سَفِیۡنَۃٍ غَصۡبًا ۝

وہ جو کشتی آپ نے دیکھی تھی جسکا تختہ میں نے توڑ دیا تھا، اس کا واقعہ دراصل یہ تھا کہ وہ مسکینوں کی کشتی تھی، اسی سے وہ اپنا کاروبار کرتے تھے، اسی کے ذریعہ ان کا گذارہ ہوتا تھا۔ آگے ایک ظالم بادشاہ بیٹھا ہوا تھا، اور جب کوئی صحیح سالم کشتی ادھر سے گذرتی تھی تو وہ اس پر غاصبانہ قبضہ کرلیتا تھا، اللہ تعالیٰ یہ چاہتے تھے کہ مسکینوں کی اس کشتی کو بچالیا جائے اس لئے مجھے حکم دیا کہ اس کا ایک تختہ توڑ کر اسکو عیب دار کردوں تاکہ آگے وہ ظالم بادشاہ اس پر قبضہ نہ کرے۔ آگے فرمایا کہ۔

وَ اَمَّا الۡغُلٰمُ فَکَانَ اَبَوٰہُ مُؤۡمِنَیۡنِ فَخَشِیۡنَاۤ اَنۡ یُّرۡہِقَہُمَا طُغۡیَانًا وَّ کُفۡرًا ۝ فَاَرَدۡنَاۤ اَنۡ یُّبۡدِلَہُمَا رَبُّہُمَا خَیۡرًا مِّنۡہُ زَکٰوۃً وَّ اَقۡرَبَ رُحۡمًا ۝

اور وہ جو لڑکا تھا جسکو میں نے مار دیا تھا، اسکی اصل وجہ یہ تھی کہ اس کے ماں باپ بڑے پکے اور دیندار مسلمان تھے، ان کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت تھی، لیکن جب سے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ بیٹا عطا فرمایا تھا روز بروز ان کی محبت بیٹے سے بڑھتی چلی جارہی تھی اور اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت کم ہوتی چلی جارہی تھی، اگر اسی طریقہ پر یہ اولاد باقی رہتی تو ممکن تھا کہ ساری محبت اس اولاد کی طرف منتقل ہوجاتی اور اللہ کے احکام کو پس پشت ڈال دیتا۔ اور اللہ کو یہ منظور نہیں تھا کہ اسکی اولاد اس کے ایمان کے راستے میں رکاوٹ بنے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی ایمان کی حفاظت

کیلئے اس لڑکے کو ہلاک کرنے کا مجھے حکم دیا۔

حاصل واقعہ اس واقعہ سے یہ بات معلوم ہوئی جو میں عرض کررہا تھا کہ بعض اوقات اولاد کی محبت میں آدمی اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت کو پس پشت ڈال دیتا ہے، اور بعضے لوگ ایسے ہیں کہ ان کے اندر مال وجائداد کی محبت اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو پیچھے ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ تجارت اور کاروبار کے اندر جائز وناجائز کو نہیں دیکھتے۔ حلال وحرام کو نہیں دیکھتے۔ قدم قدم پر اللہ کے احکام کی بھی خلاف ورزی کرتے ہیں، اللہ کے رسول کے احکام کی بھی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو مال ودولت سے محبت زیادہ اور اللہ اور اللہ کے رسول سے محبت کم ہے۔

محمود غزنوی اور ایاز محمود غزنوی کا ایک واقعہ لکھا ہے، یہ ایک بڑا غیور قسم کا پٹھان تھا جس نے ہندوستان کے اوپر حملہ کیا اور تمام بتوں کو توڑ دیا۔ سومناتھ کی مندر میں بھی پہنچا ہے وہاں کے بت کو بھی توڑا ہے۔ جس کی وجہ سے اسکا لقب بت شکن پڑ گیا تھا۔ محمود غزنوی کو ایک غلام سے محبت تھی جسکا نام ایاز تھا۔ عام طور سے فارسی اور اردو کی شاعری میں محمود غزنوی اور ایاز کا ذکر ایک ساتھ ملتا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے ؂

نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ محمود غزنوی بت شکن تھا لیکن ایک شاعر نے اس کے متعلق بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ اس نے ہندوستان کے سارے بتوں کو توڑ دیا لیکن ایک بت اس نے اپنے دل میں بٹھا لیا، اس کو نہیں توڑ سکا۔ فرمایا کہ ؂

برہمن بہ غزنوی گفت کرامتم نگر — توتو صنم شکستہ ای بندہ شدی ایاز را

تو نے سارے بتوں کو توڑ کر چکنا چور کردیا لیکن ایک بت تجھ سے بھی نہیں

ٹوٹ سکا۔ وہ محبت کا بت تھا۔ ایاز کو بت بنا کر تو نے اپنے دل میں بٹھا لیا۔

الامر فوق الادب ایاز کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ محمود غزنوی نے تمام امراءِ دربار کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ بڑے بڑے امراء، بڑے بڑے جاگیردار اور وزراء سب جمع ہو گئے۔ ایاز بھی وہاں موجود تھا۔ محمود غزنوی کے پاس ایک بڑا قیمتی ہیرا تھا۔ اس نے وہ ہیرا لیکر اپنے ایک وزیر کو دیا اور کہا کہ تم اس ہیرے کو زمین پر اس قدر زور سے دے مارو کہ وہ ٹکڑا ٹکڑا ہو جائے۔ اس نے کہا: جی حضور! میں آپ کا بڑا نمک خوار ہوں، میرے اندر یہ ہمت نہیں ہے کہ میں آپکی اتنی قیمتی چیز کو توڑ دوں! پھر دوسرے وزیر کو دیا پھر تمام درباری امیروں کو دیا لیکن سب نے ایک یہی جواب دیا کہ حضور! میرے اندر یہ ہمت نہیں ہے کہ میں آپ کے اس قدر قیمتی ہیرے کو توڑ دوں۔

یہ لکھا ہے کہ آخر میں ایاز کا نمبر آیا تو محمود غزنوی نے ایاز سے کہا کہ تم اس کو توڑ دو۔ ایاز نے اس ہیرے کو ہاتھ میں لیا اور اس قدر زور سے زمین پر دے مارا کہ اس کو چورا چورا (ٹکڑا ٹکڑا) کر دیا۔ تمام درباری امراء اور درباری وزراء ایاز کو ملامت کرنے لگے کہ ارے تو بادشاہ کا نمک خوار ہے، بادشاہ کا غلام ہے لیکن تجھے اتنا بھی خیال نہیں ہوا کہ بادشاہ کا اتنا قیمتی ہیرا توڑ دیا؟ ایاز نے بڑا اچھا جواب دیا، اس نے کہا، ارے بے وقوفو! تمہیں یہ نہیں معلوم کہ میں تو صرف بادشاہ کا ہیرا توڑا ہے لیکن تم لوگوں نے اس سے بھی زیادہ قیمتی چیز توڑی ہے، یعنی بادشاہ کا حکم توڑا ہے! بادشاہ کا حکم ہیرے سے بھی زیادہ قیمتی ہے، بادشاہ نے یہ حکم دیا تھا کہ تم یہ ہیرا توڑ دو لیکن تم سب نے انکار کر کے بادشاہ کے حکم کو توڑ دیا۔

ایک سبق تو میرے دوستو! ہیرا اتنا قیمتی نہیں ہے جتنا بادشاہ کا حکم قیمتی ہے، تو جس آدمی کے دل میں ہیرے کی عظمت ہوگی اس کے دل میں بادشاہ کے حکم

کی عظمت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طریقہ سے اگر کوئی آدمی کاروبار کے اندر، لین دین کے اندر احکام شرع کی خلاف ورزی کر رہا ہے، اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کے خلاف کر رہا ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ اسکے دل میں بیرے کی قدر ومنزلت ہے، بادشاہ کے حکم کی کوئی قدر ومنزلت نہیں ہے۔ اس کے دل میں مال وجائداد کی محبت اللہ اور اس کے رسول کی محبت سے زیادہ ہے۔ جبکہ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ آپ شوق سے ماں باپ سے محبت کریں، آپ شوق سے اولاد سے محبت کریں، آپ اپنے بھائیوں اور کنبے والوں سے محبت کریں، اپنے مال وجائداد سے محبت کریں لیکن ایک بات کا خیال رکھنا، اور وہ یہ کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت ان سب چیزوں کی محبت سے اوپر اور بلند رکھنا۔ سب سے اوپر اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت ہونی چاہیے۔ اسکے بعد ان چیزوں کی محبت ہونی چاہیے۔

دنیا کی حقیقت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں

حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بڑی اچھی مثال لکھی ہے، لکھا ہے کہ زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے کشتی۔ آپ نے بعضے علاقوں کے اندر دیکھا ہوگا کہ لوگ سڑکوں پر بیٹھ کر کشتیاں بناتے ہیں، سال چھ مہینے میں کشتی تیار ہوتی ہے۔ اب آپ بتایئے کہ جب کشتی بن کر تیار ہو جاتی ہے تو پھر کس میں چلتی ہے؟ ریت میں چلتی ہے؟ ہوا میں اڑتی ہے؟ نہ وہ ریت میں چل سکتی ہے نہ ہوا میں اڑ سکتی ہے، وہ پانی میں چلتی ہے۔ تو فرمایا کہ انسان کی زندگی کشتی کی طرح ہے، اس کو چلانے کیلئے پانی کی ضرورت ہے۔ وسائل زندگی، زندگی کا مال ومتاع، ساز وسامان اس کشتی کا پانی ہے۔ انسان کے پاس مکان بھی ہو، انسان کے پاس مال ودولت اور کاروبار بھی ہو، انسان کے پاس آل واولاد بھی ہو، ضرورت وحاجت کی تمام چیزیں مہیا ہوں، یہ سب دراصل اس کشتی کے لئے پانی ہیں، انکے بغیر یہ کشتی چل نہیں سکتی۔ لہٰذا اگر کوئی ان ضرورت اور حاجت کی چیزوں کو اپنے پاس

جمع کرلیتا ہے تو وہ اچھا کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ترک دنیا اور رہبانیت کی تعلیم نہیں دی ہے۔ آپ سے یہ نہیں کہا کہ آپ دنیا کو ترک کرکے پہاڑ کی کھوہ میں جاکر اللہ کی عبادت وبندگی کریں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ زندگی کی گاڑی کشتی کی طرح ہے اور سازوسامانِ زندگی اس کشتی کا پانی ہے۔

مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں ایک سبق اچھی طرح یاد رکھنا ! وہ یہ کہ پانی جب کشتی کے نیچے ہوتا ہے تو کشتی آسانی سے چلتی ہے اور منزل پر پہنچادیتی ہے لیکن اگر کہیں کشتی میں سوراخ ہوگیا اور اس کے اندر پانی آگیا تو یاد رکھو کشتی بھی ڈوبے گی کشتی والے بھی ڈوبیں گے۔ فرمایا کہ آپ دنیا کی تمام چیزوں سے محبت کریں لیکن اس کا خیال ہمیشہ رکھیں کہ ان سب چیزوں کی محبت اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت سے نیچے رہنی چاہیے۔ ان سب چیزوں کی محبت دل سے باہر رہنی چاہیے، دل کے اندر صرف اللہ کی محبت اور اللہ کے رسول کی محبت رہنی چاہیے۔

جسکا مطلب یہ ہے کہ اسلام ان چیزوں کے حاصل کرنے کو منع نہیں کرتا بلکہ یہ کہتا ہے کہ ان چیزونکی محبت اللہ اور اس رسول کی محبت سے زیادہ نہ بڑھنی چاہیے۔

خلاصۂ کلام میرے دوستو! قرآن کریم کی ان آیتوں کے اندر جنکی میں تلاوت کی ہے یہی سبق دیا گیا ہے کہ جب تک انسان اللہ اور اس کے رسول سے محبت نہیں کر لیتا ہے اس وقت تک اس کے احکام پر، دین پر عمل کرنا اس کیلئے مشکل رہتا ہے۔ لہذا میرے دوستو! جن جن طریقوں سے ہمارے دلوں میں اللہ اور اسکے رسول کی محبت پیدا ہوسکتی ہے ان تمام طریقوں کو ہمیں اختیار کرنا چاہیے۔ اور اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا چاہیے جن کے دلوں میں اللہ کی محبت ہے۔ اللہ کے رسول کی محبت ہے۔ کیونکہ صحبت کا بہت اثر پڑتا ہے۔ اگر آپ سگریٹ نہیں

پیتے ہیں، تو سگریٹ پینے والوں کی صحبت میں بیٹھیں گے تو چند روز میں آپ سگریٹ پینے لگیں گے۔

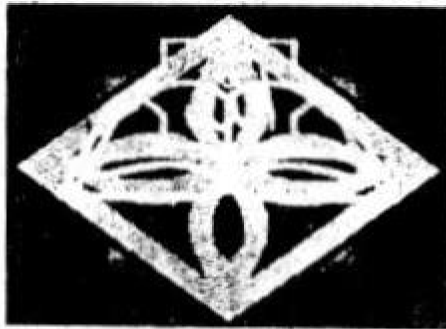
اگر آپ کے دل میں تماشہ دیکھنے کا شوق نہیں ہے لیکن تماشہ دیکھنے والوں کی صحبت میں اگر آپ بیٹھیں گے تو یہ شوق آپ کے اندر بھی پیدا ہوجائے گا۔ اگر آپ نماز نہیں پڑھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ نماز پڑھیں تو نمازیوں کی صحبت اختیار کرلیں چند دنوں میں آپ نماز پڑھنے لگیں گے۔

اسی طرح اگر ہم اور آپ عاشقوں اور اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھیں گے تو عشق و محبت کرنے کا طریقہ ہمیں آجائے گا۔ اور جب ہمارے اندر اللہ اور اس کے رسول سے عشق و محبت پیدا ہوجائے گی تو میرے دوستو! پھر ہماری زندگی درست ہوجائے گی۔ اور سب چیزوں کی محبت کے ساتھ ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا بھی ہم حق ادا کرسکیں گے۔ یہ قرآن کریم کی اس آیت کا خلاصہ تھا جو میں نے عرض کیا۔ اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔

اللھم صلی علی سیدنا ومولینا محمد صلوۃ تنجینا بھا من جمیع الاھوال والآفات۔ وتقضی لنا بھا جمیع الحاجات۔ وتطھرنا بھا من جمیع السیئات۔ وترفعنا بھا اعلی الدرجات۔ وتبلغنا بھا اقصی الغایات۔ من جمیع الخیرات فی الحیوۃ وبعد الممات۔ انک علی کل شئی قدیر برحمتک یاارحم الرحمین والحمد للہ رب العلمین





نعت شریف

زہے مقدر حضور حق سے پیام آیا سلام آیا
جھکاؤ نظریں بچھاؤ پلکیں ادب کا اعلیٰ مقام آیا

یہ کون سر سے کفن لپیٹے چلا ہے الفت کے راستے پر
فرشتے حیرت سے تک رہے ہیں یہ کون ذی احترام آیا

دعا جو نکلی تھی دل سے اک دن، پلٹ کے مقبول ہو کے آئی
وہ جذبہ جس میں تڑپ تھی سچی وہ جذبہ آخر کو کام آیا

یہ راہ حق ہے سنبھل کے چلنا یہاں ہے منزل قدم قدم پر
پہنچنا در پر تو کہنا آقا! سلام لیجئے غلام آیا

یہ کہنا آقا بہت سے عاشق تڑپتے سے چھوڑ آیا ہوں میں
بلاوے کے منتظر ہیں لیکن نہ صبح آیا نہ شام آیا

زہے مقدر حضور حق سے پیام آیا سلام آیا
جھکاؤ نظریں بچھاؤ پلکیں ادب کا اعلیٰ مقام آیا



عشق رسول ﷺ

یہ راستہ سرکار دو عالم ﷺ نے اختیار نہیں فرمایا۔ سرکار کا راستہ کیا تھا؟ ایک صحابی رضی اللہ عنہ آپؐ کے پاس آکر عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہؐ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ خوب سوچ لو پھر کہو! انہوں نے پھر کہا۔ مجھے آپ سے محبت ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم کو مجھ سے محبت ہے تو فقر وفاقہ کیلئے تیار ہو جاؤ، تکلیفیں سہنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔

اب آپ اس واقعہ سے اندازہ لگائیے۔ یہ اسلام کا طریقہ نہیں ہے کہ کسی عمل کے اوپر دنیوی فائدہ کا وعدہ کیا جائے۔ اسلام کے اندر یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہیں ملازمت دلوا دیں گے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہاری شادی کرادیں گے وغیرہ۔ اسلام نے اس طریقہ کو اختیار نہیں کیا ہے۔ اسلام کا طریقہ تو یہ ہے کہ ؎

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو
گیرودارد حاجب ودرباں دریں درگاہ نیست

ہم نے اسلام کیلئے نہ کوئی ایجنٹ (AGENT) چھوڑا ہے اور نہ کسی سنتری اور پہرہ دار کو بٹھا رکھا ہے۔ جسکا جی چاہے اسلام میں آئے اور جسکا جی چاہے جائے۔





اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ

وَاَصْحٰبِهٖ اَجْمَعِيْنَ

اَمَّابَعْدُ. فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ سُوْرَةُ التَّوْبَةِ

صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيْمِ وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○

عرض حال

بزرگانِ محترم اور برادران عزیز! مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ تقریباً چار سال کے عرصہ کے بعد آپ سے ملنے کا اور پاس بیٹھ کر دینی باتیں کرنے کا موقعہ ملا۔ اگرچہ میں جب کراچی سے سفر کیلئے روانہ ہوا تو میرے پروگرام میں ساؤتھ افریقہ (SOUTH AFRICA) کا سفر شامل نہیں تھا، بہت دنوں سے ماریشس (MAURITIUS) کے احباب خط لکھ رہے تھے لیکن کچھ ایسی مصروفیتیں تھیں کہ جن کی وجہ سے میرا وہاں جانا نہیں ہوسکا۔ اس مرتبہ زامبیا (ZAMBIA) کے مسلمانوں نے مجھے بلایا تو میں نے ارادہ کیا کہ زامبیا ہوتے ہوئے ماریشس بھی ہو آؤں لیکن ساؤتھ آفریقہ کے دوستوں کو میرے اس سفر کی خبر ہو گئی چنانچہ وہ سفر کر کے پہنچ گئے اور یہاں

آنے کیلئے انہوں نے بہت اصرار کیا۔ مجھے انکار کرتے ہوئے کچھ حیا آئی اس لئے میں نے تھوڑا سا وقت ساؤتھ آفریقہ کیلئے نکالا۔ اور آپ حضرات کی خدمت میں میری حاضری ہوئی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو دینی اور روحانی فائدہ عطا فرمائے۔

تبلیغ کا مؤثر طریقہ خصوصی ملاقات

میرے دوستو! اس وقت میں آپ حضرات کے سامنے تقریر اور وعظ کرنے کیلئے کھڑا ہوا ہوں جیسا کہ اس زمانے میں یہ ایک طریقہ پڑ گیا ہے، ایک رواج قائم ہو گیا ہے، اور یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ دین پھیلانے کیلئے اور اسکو لوگوں تک پہنچانے کیلئے جلسوں، کانفرنسوں اور تقریروں سے زیادہ مفید طریقہ پاس بیٹھ کر باتیں کرنے کا ہے۔ خطاب کرنے کا موجودہ طریقہ بعد کے لوگوں نے ایجاد کیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے اور فیض صحبت حاصل کرتے تھے اسی لئے ان کو صحابی کہا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر خلیفہ تھے کراچی (KARACHI) میں مجھ سے فرمایا کہ ایک موقعہ سے میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی (ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY) گیا۔ کچھ طالب علم میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ طلبا کے سامنے تقریر کریں۔ مولانا نے فرمایا کہ میں نے منظور کرلیا لیکن میں نے ان طالب علموں سے یہ پوچھا کہ تقریر کرانے سے آپ کا کیا مقصد ہے؟ کہنے لگے کہ دین کا فائدہ مقصود ہے! سید صاحب فرمانے لگے کہ اگر آپ کا مقصد دین کا فائدہ ہے تو وہ تقریر سے حاصل نہیں ہوگا۔ میرے پاس آکر بیٹھئے اور استفادہ کیجئے، اس سے فائدہ حاصل ہوگا۔

ایک مثال

اور اسکی بڑی اچھی مثال دی۔ فرمایا کہ اگر حکیم اجمل خان صاحب اپنے دواخانہ میں بیٹھیں اور ایک ہزار مریض اور بیمار ان کے دوا خانے میں آکر ایک ساتھ بیٹھ جائیں اور حکیم اجمل خان صاحب اپنی کتاب یا اپنی کاپی سے ٹی بی (T.B.) کا نسخہ

پڑھکر ان کو سنا دیں اور یہ بھی بتا دیں کہ یہ بیماری کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ اور اگر پیدا ہو جائے تو اسکا علاج کیا ہے؟ اس علاج میں پرہیز کیا ہے؟ فرمایا کہ اس لکچر (LECTURE) سے ان ایک ہزار مریضوں میں سے صرف دو تین مریض کو ہی فائدہ ہو گا جو ٹی بی (T.B.) کے مریض ہوں گے باقی کسی کو فائدہ نہیں ہو گا۔ کیونکہ کوئی پیٹ کا مریض ہو گا۔ کسی کے گھٹنے میں تکلیف ہوگی، کسی کی آنکھیں دکھ رہی ہوں گی۔ کسی کے پھیپھڑے میں تکلیف ہوگی لہذا ٹی بی کا وہ نسخہ جو پڑھ کر سنایا گیا ہے وہ پورے مجمعہ کیلئے مفید نہیں ہو گا۔ البتہ اگر حکیم صاحب یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ ایک ایک بیمار ان کے پاس آتا ہے اور وہ اس کی نبض دیکھتے ہیں، اسکا حال پوچھتے ہیں اور اس کے مطابق اس کو دوا بتاتے ہیں تو ایک ہزار کے ایک ہزار مریضوں کو فائدہ ہو گا۔

آنحضرت ﷺ کا طریقہ اصلاح یہی طریقہ سرکار دو عالم ﷺ کا طریقہ تھا، آپ کی مجلس اور آپ کی محفل میں روحانی بیمار آتے تھے اور اس زمانہ میں روحانی بیماری کی اہمیت جسمانی بیماری سے زیادہ تھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین آپ ﷺ کی خدمت میں اور آپ کی مجلس میں حاضر ہوتے اور فرداً فرداً اپنا مرض بیان کرتے تھے۔ کوئی کہتا کہ یا رسول اللہ! میرے دل میں سختی پیدا ہو گئی ہے، قساوتِ قلبی کے مرض میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ آپ ﷺ ان سے فرماتے کہ تم یتیم بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا کرو اس سے انشاء اللہ تمہارے دل میں نرمی پیدا ہوگی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے کسی کو کوئی نسخہ بتایا کسی کو کوئی اور دوا بتائی، سب کو فائدہ ہوا۔

لیکن شاید وقت کی تنگی کی وجہ سے اس زمانہ میں لوگوں نے وعظ و تقریر کا یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ آجکل کے لوگوں کو عالم کی صحبت میں بیٹھنا تو درکنار ان کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھ لیں۔ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب! نماز میں "قل ھو اللہ" پڑھنا! تاکہ ذرا جلدی سے فارغ ہو جاؤں۔

عوام الناس کی دینی مجالس سے بے اعتنائی بہر حال! آج یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اور کچھ مختصر سی باتیں میں آپ حضرات کی خدمت میں بھی پیش کرنا چاہتا ہوں یہ جانتے ہوئے کہ اس زمانے میں لوگ وعظ و تقریر، پند و نصیحت سنجیدگی کے ساتھ نہیں سنتے ہیں، یہاں تک کہ ہمارے نوجوان یہ کہتے ہیں کہ ارے بھائی! وعظ و تقریر میں کیا ہو گا؟ وہی آخرت کی باتیں ہوں گی، وہی جنت و جہنم کی باتیں ہوں گی، وہی 'ادھار والی باتیں ہوں گی، نقد والی بات تو مولوی صاحب کہیں گے نہیں: یہی کہیں گے کہ عالم آخرت میں تمہیں یہ ملے گا وہ ملے گا۔ جبکہ آج ہمیں ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی ایسا نسخہ بتائیں کہ جس سے ہماری تنخواہ میں اضافہ ہو جائے۔ ہماری آمدنی میں اضافہ ہو جائے، ہمارے پیٹ کا فائدہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ راستہ سرکار دو عالم ﷺ کا راستہ نہیں ہے، اگر ہم بھی یہی راستہ اختیار کرلیں تو یہ ہمارے نبی اور پیغمبر کے راستہ کے خلاف ہو گا۔

ایک لطیفہ کسی مولوی صاحب نے اسی راستہ کو اختیار کر کے کسی گاؤں میں جا کر یہ کہہ دیا تھا کہ بھائی دیکھو! اگر تم چالیس دن تک پابندی کے ساتھ با جماعت نماز پڑھو گے تو تمہیں ایک بھینس ملے گی، گاؤں والے نے یہ سوچا کہ بھینس تو پانچ سو روپیہ کی آتی ہے، اگر چالیس دن کی نمازوں سے بھینس ملتی ہے تو چلو پڑھ لو۔ چنانچہ اس نے نماز پڑھنی شروع کردی۔ بیس دن گذرے، پچیس دن گذرے، تیس دن گذرے، اب جب اس نے دیکھا کہ وقت قریب آرہا ہے تو بھینس باندھنے کیلئے کھونٹا گاڑ دیا، اور جب دیکھا کہ دو تین دن باقی رہ گئے ہیں تو بھینس کے کھانے کا جو کونڈا (بھونسا) ہوتا ہے وہ بھی خرید کرلے آیا۔ جب چالیس دن پورے ہو گئے اور بھینس نہیں ملی تو مولوی صاحب سے جا کر کہا کہ مولوی صاحب! آپ نے کہا تھا کہ چالیس دن کے بعد بھینس ملے گی تو اب چالیس دن پورے ہو گئے، لائیے کہاں ہے بھینس؟ مولوی صاحب نے کہا، ارے اللہ کے بندے

میں نے تو یہ اس لئے کہا تھا کہ حدیث میں آتا ہے، جب کوئی نیکی متواتر چالیس دن تک کی جاتی ہے تو انسان کے دل میں اس نیکی کا چشمہ پیدا ہو جاتا ہے، لہذا میرا مقصد یہ تھا کہ اگر تو متواتر چالیس روز تک نماز پڑھے گا تو تو اسکا عادی ہو جائے گا، میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ تجھے بھینس بھی یاد رہے گی، اس نے کہا، مولوی صاحب! میرے دل میں پہلے ہی یہ کھٹکا پیدا ہو گیا تھا کہ پتہ نہیں آپ صحیح کہہ رہے ہیں یا غلط کہہ رہے ہیں اس لئے میں نے بھی بلا وضو ہی نماز پڑھی ہے۔

اسلامی راستہ یہ راستہ سرکار دو عالم ﷺ نے اختیار نہیں فرمایا، سرکار کا راستہ کیا تھا؟ ایک صحابی رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آکر عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ حضور نے فرمایا کہ خوب سوچ لو پھر کہو، انہوں نے پھر کہا، مجھے آپ سے محبت ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم کو مجھ سے محبت ہے تو فقر و فاقہ کیلئے تیار ہو جاؤ، تکلیفیں سہنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ (ترمذی کتاب الزھد / ۲۲۰۳) اب آپ اس واقعہ سے اندازہ لگایئے، یہ اسلام کا طریقہ نہیں ہے کہ کسی عمل کے اوپر دنیوی فائدہ کا وعدہ کیا جائے۔ اسلام کے اندر یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہیں ملازمت دلوا دیں گے، اگر تم ایسا کرو گے تو تمہاری شادی کرا دیں گے وغیرہ۔ اسلام نے اس طریقہ کو اختیار نہیں کیا ہے۔ اسلام کا طریقہ تو یہ ہے کہ

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو

گیر و دار و حاجب و دربان دریں درگاہ نیست (دیوان حافظ / ۲۵)

ہم نے اسلام کیلئے نہ کوئی ایجنٹ (AGENT) چھوڑا ہے اور نہ کسی سنتری اور پہرہ دار کو بٹھا رکھا ہے، جس کا جی چاہے اسلام میں آئے اور جسکا جی چاہے جائے۔

مزدوری اور بندگی کا فرق تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ راستہ اسلام کا راستہ نہیں ہے لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ آپ اپنے پیٹ کیلئے نہ سوچیے۔

بے شک سوچیئے اور سوچنا بھی چاہیے۔ لیکن اس کیلئے سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ ہے مزدوری کا اور دوسرا طریقہ ہے بندگی کا۔ مزدوری کا طریقہ یہ ہے کہ آپ نے بازار سے کوئی چیز خریدی لیکن آپ اسے اٹھا کر اپنے گھر نہیں لے جاسکتے۔ آپ نے کسی مزدور کو بلایا اور کہا کہ میاں اس کو میرے گھر پہنچادو! وہ کہتا ہے کہ پہلے یہ بتادو کہ کیا دوگے پھر ہاتھ لگاؤں گا؟ آپ نے اسکو کچھ رقم بتائی۔ وہ کہنے لگا کہ میں اتنا نہیں لوں گا۔ میں تو ایک روپیہ لوں گا۔ پھر جھگڑا ہوا آخر میں ایک روپیہ پر طے ہوگیا۔ تو پہلے اس نے آپ سے اپنا معاملہ طے کرلیا پھر آپ کا سامان اٹھا کر آپ کے گھر لے گیا۔ آپ نے اسکو اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر دے دیا اب اگر وہ روپیہ دیکھ کر آپ سے یہ کہے کہ بھائی! زمانہ بڑی مہنگائی کا ہے اور میرے آٹھ بچے ہیں۔ ماں باپ ہیں۔ اس ایک روپیہ میں کیا ہوگا۔ تو آپ یہی کہیں گے کہ بھائی! تیری مزدوری جو طے ہوئی تھی وہ میں نے دے دی۔ اب مجھے اس سے بحث نہیں کہ تیرے یہاں آٹھ آدمی کھانے والے ہیں، آٹھ نہیں اگر آٹھ سو آدمی بھی ہیں تو مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے تو جان تیرا کام جانے۔ یہ راستہ مزدوری کا راستہ ہے۔

دوسرا راستہ بندگی کا راستہ ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے سامان خریدا اور کسی مزدور سے کہا کہ بھائی! اسے اٹھا کر میرے گھر پہنچادو۔ وہ فوراً آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے سامان اٹھانے لگا۔ آپ نے کہا۔ بھائی! تم نے کچھ طے ہی نہیں کیا؟ پہلے مزدوری طے کرلو پھر سامان کو ہاتھ لگاؤ۔ وہ کہنے لگا حضور! میرا کام سودا کرنا نہیں ہے کہ میں پہلے سے یہ طے کرلوں کہ آپ کیا دیں گے۔ سامان اٹھا کر آپ کے گھر پہنچا دینا میرا کام ہے اور میری ضرورت کے مطابق دینا آپ کا کام ہے۔ آپ جو مناسب سمجھیں وہ دے دیں۔ چنانچہ اس نے آپ کا سامان اٹھا کر گھر پر پہنچا دیا۔ اب آپ نے اس سے پوچھا کہ بھائی! تمہارے کتنے بچے ہیں؟ کھانے والے کل کتنے افراد ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ

دس آدمی میرے گھر میں کھانے والے ہیں؛ آپ نے دس روپے کا نوٹ نکال کر اسے دے دیئے کہ یہ بیچارہ غریب ہے۔ تو دیکھئے کام تو اس نے ایک روپیہ کا کیا ہے لیکن آپ نے اسے دس روپے دیئے ہیں۔ یہ راستہ بندگی کا راستہ ہے۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم پیٹ کی فکر نہ کرو البتہ یہ کہتا ہے کہ تم اللہ کے ساتھ مزدوری کا راستہ اختیار نہ کرو، بندگی کا راستہ اختیار کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بندہ پروری کا طریقہ اختیار کرے گا۔ فرمایا کہ؎

تو بندگی چوں گدایاں بشرط مُزد مکن
کہ خواجہ خودروش بندہ پروری داند (دیوان حافظ / ۱۶۸)

مُزد کے معنی مزدوری کے آتے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے پہلے سودا نہ کرو۔ اللہ کو تمہاری حاجتوں اور ضرورتوں کا علم ہے۔ تم اللہ کے کہنے سے فوراً دین کے کام میں لگ جاؤ؛ وہ تمہاری حاجتوں اور ضرورتوں کے مطابق تمہیں دے گا۔

وعظ کرتے رہنا چاہیئے ،اثر ہو یا نہ ہو تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آجکل لوگ وعظ کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں سنتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وعظ کہنے والے وعظ کہنا روک دیں بلکہ وعظ کہیں، پند و نصیحت کریں اور کبھی یہ خیال نہ کریں کہ میری پند و نصیحت سے کتنے آدمیوں پر اثر ہوتا ہے، ایک آدمی پر بھی اثر ہو وعظ کہنا چاہیئے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو (۹۵۰) سال تک تبلیغ کی ہے اور اس دوران سات نسلیں تبدیل ہو گئیں لیکن قرآن کریم کی شہادت اور گواہی ان کے سلسلہ میں یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام جتنا جتنا قوم کو توحید کی طرف بلاتے تھے اتنی ہی قوم دور بھاگتی تھی لیکن حضرت نوح علیہ السلام نے پند و نصیحت اور وعظ کو ترک نہیں فرمایا۔

اور آجکل تو بعض نوجوان یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ آج وعظ و تقریر تو بہت ہوتے ہیں لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلتا کیونکہ اس زمانہ کے علماء کے اندر ہی گرمی

اور حرارت باقی نہیں رہی جسکی وجہ سے ہمارے دلوں پر ان کے وعظ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہاں بھی الزام اپنے آپ کو نہیں علماء کو ہی دیتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ بیچارے علماء جو ہیں وہ در اصل ایسے ہیں جیسے بھٹیارا کا ایک لونڈا تھا۔ ہمارے یہاں بھٹیارے کی دکان ہوتی ہے جہاں مسافر ٹھہرتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں۔

ایک بھٹیاری کی حکایت ایک پولیس والا (POLICE MAN) کسی بھٹیاری کے یہاں ٹھہر گیا، اس نے بھٹیاری سے کہا کہ ذرا جلدی سے روٹی پکا دینا مجھے بھوک لگی ہے۔ وہ بیچاری روٹی پکانے لگی، اس کا بچہ اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور پولیس والا سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ روٹی پکاتے پکاتے اتفاق سے اس کا وضو ٹوٹ گیا اور وضوء ٹوٹنے کی آواز بھی آئی۔ بیچاری وہ بہت شرمندہ ہوئی کہ پولیس والا سامنے بیٹھا ہوا ہے، اس نے اپنی شرمندگی اتارنے کیلئے اپنے بچے کو زور سے چانٹا مارا کہ کمبخت! تجھے شرم نہیں آتی؟ گویا وہ پولیس والے کو یہ بتارہی تھی کہ یہ حرکت میری نہیں ہے اس بچے کی ہے۔ لیکن پولیس والے بھی بڑے تیز ہوتے ہیں، وہ سمجھ گیا، اس نے بھی اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور زور سے اپنا وضو توڑا۔ اور اس کے بعد اٹھ کر بچے کو چپت ماردیا۔ بھٹیاری نے کہا، بھائی! کیا بات ہے؟ تو نے میرے بچے کو کیوں مارا؟ اس نے کہا، میں نے اس گھر کا یہی طریقہ دیکھا ہے کہ کرے کوئی پٹے کوئی۔ جب تو نے یہ حرکت کی تھی تو اس کو چپت لگائی لہٰذا جب میں نے یہ حرکت کی تو میں نے بھی اسی کو طمانچہ مارا۔

علماء کو الزام دینے سے اپنا بھی جائزہ لینا چاہیے اسی طرح یہاں بھی لوگ یہی کہتے ہیں کہ علماء میں حرارت نہیں ہے۔ آپ لوگوں کو شاید یاد ہوگا کہ کسی زمانے میں ہندوستان کے اندر راشن کی لکڑی بکتی تھی تو لوگ اس کو پانی میں بھگادیتے تھے تاکہ زیادہ بھاری ہوجائے اور فائدہ زیادہ ہو۔ اور جب اس گیلی لکڑی سے ماچس (MATCHES) کی تیلی بنائی جاتی تھی تو اس میں آگ نہیں پکڑتی تھی۔ کیونکہ ماچس چاہے آپ لندن

(LONDON) سے منگائیے چاہے آپ امریکہ (AMERICA) سے منگائیے یا چاہے آپ دنیا کے کسی بھی ملک سے منگائیے۔ ماچس تو اچھی ہوتی ہے لیکن اگر لکڑی راشن کی ہو اور وہ بھی بھیگی ہوئی ہو تو اس میں آگ نہیں پکڑ سکتی۔ یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ ماچس خراب ہے۔ ماچس تو اچھی ہوتی ہے لیکن لکڑی بھیگی ہوئی ہوتی ہے جو کسی طرح آگ کو قبول نہیں کرتی۔ فرمایا کہ ؎

یا میری آہ میں کوئی شرر زندہ نہیں
یا ذرا نم ابھی تیرے خس وخاشاک میں ہے

کچھ اپنا بھی جائزہ لو۔ تم نے تو یہ کہہ دیا کہ ماچس ٹھیک نہیں ہے۔ ارے بھائی! کبھی کبھی تم اپنے آپ کو بھی تو ذرا دیکھو! تم بھی تو گیلی لکڑی کی طرح بن گئے ہو کہ کسی طرح آگ کو قبول ہی نہیں کرتے۔

حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! میں تیس سال سے قبرستان میں اذان دے رہا ہوں لیکن کوئی مردہ نہیں اٹھا۔ مولانا نے وعظ کہنے کو قبرستان میں اذان دینے سے تشبیہ دی۔ اس لئے کہ جس طرح قبرستان میں اذان دینے پر کوئی مردہ جواب نہیں دیتا اسی طرح قوم بھی مردہ ہو گئی ہے کہ وعظ ونصیحت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور مولانا نے فرمایا کہ اس قبرستان میں سے کوئی مردہ اٹھے یا نہ اٹھے مگر ہمارا کام تو اذان دینا ہے لہٰذا ہم اذان دیتے رہیں گے!

فرد کی بیماری اور قوم کی بیماری کا فرق اسی طرح میں بھی آپ حضرات کی خدمت میں چند کلمات پیش کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ جس طرح ایک آدمی بیمار پڑتا ہے اور (جب اسکا علاج صحیح طریقہ سے نہیں ہوتا ہے تو) کبھی مر بھی جاتا ہے اسی طریقہ سے کبھی کبھی قومیں بھی بیمار پڑتی ہیں اور اگر ان کا مرض لاعلاج ہو جائے تو مر بھی جاتی ہیں۔ اس کے بعد قوم کے افراد تو چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، زندہ ہوتے ہیں لیکن قوم مرجاتی ہے۔

ایک انسان جن بیماریوں سے مرتا ہے ان کے نام تو آپ کو معلوم ہیں۔ کسی کو کینسر (CANCER) ہوجاتا ہے۔ کسی کو (CHOLERA) ہوجاتا ہے۔ کسی کو ٹی بی (TUBER CLUSIS) ہوجاتی ہے اور کسی کو کوئی اور بیماری ہوجاتی ہے جس کیوجہ سے وہ مرجاتا ہے۔ لیکن جن بیماریوں سے قومیں اور ملتیں مرتی ہیں ان بیماریوں کے نام کیا ہیں؟ فرمایا کہ؂

زندہ ہے مشرق تیری گفتار سے
امتیں مرتی ہیں کس آزار سے

قومیں کس بیماری سے مرتی ہیں؟ ہمیں اس بیماری کا نام بتاؤ؟ مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اسکا جواب دیا ہے۔ فرمایا کہ؂

ہر ہلاک امت پیشیں کہ بود
زاں کہ بر جندل گماں بردند عود (بالِ جبریل/۱۳۰)

عود ایک خوشبودار لکڑی ہوتی ہے اور جندل کہتے ہیں ٹھیکرے کو۔ فرمایا کہ جب کوئی قوم اپنی تنزلی کے اس منزل پر پہنچ جائے کہ اس کے اندر حق و باطل کی پہچان نہ رہے۔ وہ عود اور جندل کے درمیان فرق نہ کرسکے اور صحیح اور غلط کی قوت تمیز اس کے اندر سے ختم ہوجائے تو فرمایا کہ یہی وہ بیماری ہے کہ جس سے قومیں ہلاک ہوجایا کرتی ہیں دوسری کوئی بیماری نہیں ہے۔

احتساب نفس اور اس کا طریقہ میرے دوستو! آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم اپنا جائزہ لیں اور یہ سوچیں کہ ہماری ملت اور ہماری قوم میں یہ بیماری ہے یا نہیں؟ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جائزہ لینے کا بڑا اچھا طریقہ بتادیا ہے۔ فرمایا کہ شریعت اسلامیہ کے اندر جتنے کام کرنے کے ہیں جنہیں "اوامر" کہتے ہیں اور جتنے کام نہ کرنے کے ہیں جنہیں "نواہی" کہتے ہیں ان دونوں قسم کے کاموں کا ایک

چارٹ (CHART) بنا کر اپنے سامنے رکھ لو۔ پھر اس چارٹ کے ذریعہ یہ دیکھو کہ جتنے کام کرنے کے ہیں ان میں سے کتنے کام ہم نے (بحیثیت قوم) کئے ہیں اور جتنے کام نہ کرنے کے ہیں ان میں سے کتنے کام سے ہم رکے ہیں۔ تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ جتنے کام کرنے کے بتائے گئے تھے ان میں سے ایک کام بھی ایسا نہیں ہے کہ جس پر عمل کیا گیا ہو اور جتنے کاموں سے منع کیا گیا تھا ان میں سے بھی ایک کام بھی ایسا نہیں ہے کہ اس سے ہم رک گئے ہوں۔ تو جب ہماری ملت اور ہماری قوم کا یہ عالم ہے تو یہ قوم صرف بیماری نہیں ہے بلکہ سر سے پاؤں تک بیماری میں ڈوبی ہوئی ہے۔ فرمایا کہ

یک تن و خیلے آرزو دل بہ کجا کجا دہم
تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

فرمایا کہ اگر ایک زخم ہو تو اس پر مرہم کا پھایہ رکھا جا سکتا ہے لیکن اگر سارا جسم زخمی ہو جائے تو کہاں کہاں پر پھایہ رکھا جائے؟

نیم حکیم خطرہ جان میرے دوستو! آج اگر دیکھا جائے تو ہماری قوم خواہ وہ دنیا کے کسی خطہ میں آباد ہو۔ دنیا کے کسی علاقے سے تعلق رکھتی ہو بیمار ہے اور سر سے پاؤں تک بیماری میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور معاف کیجئے ہم نے اپنا نبض بھی ایسے حکیموں کو دکھا یا ہے جو اناڑی ہیں۔ بعض حکیم اناڑی بھی ہوتے ہیں۔ ایک ایسے ہی حکیم کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وہ قبرستان کے پاس سے گذرے تو اپنے منہ پر رومال رکھ لیا اور رومال سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت! آپ نے اپنا چہرہ کیوں چھپا لیا؟ کہنے لگے کہ بھائی! یہ جتنے لوگوں کی قبریں ہیں وہ سب کے سب میرے ہاتھوں سے سُلائے ہوئے ہیں اس لئے ان کے سامنے چلنے سے مجھے شرم آتی ہے۔

معاف کیجئے ہم نے بھی ایسے ہی حکیموں اور طبیبوں کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا ہے جو نہ مرض کو پہچانتے ہیں اور نہ انہیں دوا کی خبر ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ چلہ کشی

کر کے اور معرفت الٰہی حاصل کر کے آئے تھے کہ ایک حکیم آکر ان کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ حضرت! آپ کی تو ساری طاقت ختم ہو گئی ہے۔ آپ کے اندر تو حرارت بالکل نہیں ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ؎

از سر بالین من بر خیز اے ناداں طبیب

دردمند عشق را دارو بجز دیدار نیست

اے نالائق حکیم! تو میرے پاس سے اٹھ جا، اور میری نبض نہ دیکھ! اس لئے کہ تجھے یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ میری بیماری کیا ہے۔ ارے ظالم! ایسے مریض جو مریضِ عشق ہوتے ہیں انہیں گاؤزبان اور گل بنفشہ نہیں دیا جاتا ہے انہیں محبوب کی زیارت کرائی جاتی ہے۔

اسی طرح آج ہماری نبض ایسے حکیموں کے ہاتھوں میں ہے جنہیں یہ نہیں معلوم کہ امت کی بیماری کیا ہے اور اس کیلئے کیا دوا تجویز کرنی چاہئے۔ پچھلے دنوں بڑے بڑے ریفارمر (REFORMER) (مصلح قوم) اور بڑے بڑے مفکرین نے ہماری نبضوں کو دیکھا اور دیکھ کر یہ کہا کہ دیکھو بھائی! ہم بتاتے ہیں کہ تمہاری بیماری کیا ہے اور اسکا علاج کیا ہے۔ اور انہوں نے اسی طرح بتائی جیسا کہ ایک بوجھ بجھکڑ نے بتایا تھا۔

ناقص مدبر کی رائے پر چلنے کا انجام یوپی (U.P.) میں گاؤں کے اچھے اور سمجھدار آدمی کو لوگ بوجھ بجھکڑ کہا کرتے ہیں، بوجھنے کے معنی آتے ہیں سمجھنے کے اور بوجھ بجھکڑ کے معنی ہیں دانشور، بڑا عقلمند جو قوم کی ساری مشکلات کا حل نکالتا ہے۔ تو ایک بوجھ بجھکڑ کے پاس گاؤں والے گئے اور جاکر کہا کہ جی! ایک بڑی مشکل پیش آگئی ہے، ایک بڑا پرابلم (PROBLEM) ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ ہمارا ایک آدمی تاڑ کے درخت پر چڑھ گیا ہے اور اسے اترنے نہیں آتا ہے۔ اب ہمارے پاس کوئی حیلہ وغیرہ نہیں ہے کہ اس کو اتنے اونچے سے کیسے اتاریں۔ بوجھ بجھکڑ نے کہا، ارے! یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے

بہت آسان ہے۔ ایسا کرو کہ ایک موٹا سا مضبوط رسالے لو اور اس کا ایک سرا تم پکڑ لو اور دوسرا سرا اوپر تاڑ کے درخت پر پھینکو، جب وہ اسکو پکڑ لے تو اس سے کہنا کہ اسکو وہ اپنے کمر میں باندھ لے۔ جب وہ کمر باندھ لے تو ایک ہی ساتھ سب مل کر اتنا زور سے دھکا دینا کہ وہ نیچے چلے آئے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا کہ اس کو ایک رسا دیا اور جب اس نے اس رسا کو اپنی کمر میں باندھ لیا تو اس کو جھٹکا دے کر نیچے بلایا۔ وہ راستہ ہی میں مر گیا۔ قوم نے بوجھ بجھکڑ سے جا کر کہا کہ جناب! آپ نے ہمیں ایسی ترکیب بتائی کہ وہ آدمی مر گیا۔ تو وہ کہنے لگا کہ معلوم نہیں تم نے کس طرح کھینچا ہے۔ ہم نے تو ایسے بہت سے آدمیوں کو جو کنویں میں گر جاتے تھے اسی ترکیب سے نکالا ہے لیکن ایک بھی نہیں مرے۔ ارے تجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ظالم! کنویں سے نکالنا اور بات ہے، بلندی سے کھینچنا اور بات ہے اور بوجھ بجھکڑ بن گیا ہے؟

ملت کے نادان مصلح ان مفکرین اور حکیموں نے ہماری نبض کو دیکھ کر کیا بیماری بتائی؟ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کی تنزل کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس دولت و ثروت نہیں ہے، جب تک یہ قوم اپنی تجوریاں نہیں بھرلے گی اس وقت تک یہ ترقی نہیں کر سکتی، جب تک یہ قوم لکھ پتی اور کروڑ پتی نہ بن جائے اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی، اگر یہ قوم دولت مند ہو جائے تو پھر ترقی کرلے گی۔ چنانچہ مسلمانوں نے دولت کے حصول کیلئے آنکھیں بند کر کے دوڑنا شروع کیا، اور جب دولت مند ہو گئے تو اور بھی زیادہ دین سے دور ہو گئے۔ مجھے یہاں کے دولت مندوں کے نام تو معلوم نہیں ہیں البتہ پاکستان کے بعض دولت مندوں کے نام معلوم ہیں، میں کبھی کبھی وہاں تقریروں میں کہا یہ کرتا ہوں کہ داؤد۔ عالم گیر اور اصفہانی وغیرہ یہ لوگ یہاں کے سب سے بڑے دولت مند ہیں۔ ایمانداری سے بتایئے گا کہ کیا یہ لوگ ساری رات تہجد پڑھتے ہیں؟ کیا یہ لوگ دین و شریعت پر سب سے زیادہ عمل کرتے ہیں؟ کیونکہ آپ لوگوں نے یہ

سمجھ رکھا ہے کہ ترقی صرف دولت سے ہوتی ہے۔ نہیں! ترقی دولت سے نہیں ہوتی ہے۔ تنزلی کی وجہ مسلمانوں کی غربت نہیں ہے۔ پھر تنزلی کی کیا وجہ ہے؟

مسائل کا حل اقبال کی نظر میں علامہ اقبال نے اسکی اصل وجہ بتائی ہے۔ فرمایا کہ

سبب کچھ اور ہے تو جسکو خود سمجھتا ہے || زوال بندہ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں میرا جو ہر آشکار ہوا || قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

مسلمانوں نے قلندری سے ترقی کی ہے، تونگری سے ترقی نہیں کی ہے۔ پیسے کی کمی کی وجہ سے مسلمانوں کو زوال نہیں آیا ہے۔

تو میرے دوستو! علامہ اقبال نے اپنے اس کلام میں بیماری بیماری کے ساتھ ساتھ اس کا علاج بھی بتلادیا ہے، اس لئے کہ اگر آپ کے بدن پر پھنسیاں نکل آئیں تو جو ماہر حکیم ہوتا ہے وہ ان پھنسیوں کا علاج نہیں کرتا کیوں کہ اگر آج ان پھنسیوں کا علاج کیا تو کل دوسری پھنسیاں نکل آئیں گی اس لئے وہ اس کے سبب کا علاج کرتا ہے اور اسکا سبب ہے فسادِ خون؛ جب وہ اسکا علاج کردیتا ہے تو پھنسیاں نکلنا بند ہوجاتی ہیں۔

مسلمانوں کی اصل بیماری اور اسکا علاج اسی طرح ہمارے اندر جو بیماری ہے اس کا اہم سبب یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں سرکار دوعالم ﷺ کی محبت باقی نہیں رہی۔ ہماری ساری بیماریوں کی جڑ یہی ہے۔ جب مسلمانوں کے دلوں میں اللہ اور اللہ کے رسول سے محبت تھی، وہ اللہ اور اللہ کے رسول کے دیوانے اور عاشق تھے تو یہ بیماریاں ان کے اندر نہیں تھیں اور جب رفتہ رفتہ ہمارے دل محبت سے خالی ہوتے گئے، ایک دو نہیں سینکڑوں بیماریاں ہمارے اندر آتی گئیں۔ لہذا اب ان بیماریاں کو دور کرنے کا علاج یہی ہے کہ ہم اپنے دلوں کے اندر اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت بھر دیں۔ اور وہ محبت بھی کیسی ہونی چاہیے؟ میں نے قرآن کریم کی جو آیتیں پڑھی ہیں وہ یہی بتلانے کیلئے پڑھی ہیں کہ وہ کیسی محبت ہے جو اللہ میاں ہم سے چاہتے ہیں، اس لئے کہ

محبت کی بھی الگ الگ قسمیں ہیں۔

ناقص عشق کی فرضی مثال شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کے بارے میں یہ مشہور ہے، اور پتہ نہیں حقیقت کیا ہے؟ اس لئے کہ بہت سی غلط باتیں بھی ان کی طرف منسوب کر کے مشہور کردی گئی ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ ان کو کسی سے محبت ہو گئی۔ محبوب نے شیخ سعدی کو آزمانا چاہا، اس نے کہا، چلئے ذرا دریا کے کنارے بیٹھیں۔ شیخ سعدی وہاں تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے شیخ سعدی سے کہا کہ چلئے ذرا پانی کے اندر چلیں۔ وہ خود تو تیرنا جانتا تھا لیکن شیخ سعدی تیرنا نہیں جانتے تھے۔ وہ شیخ سعدی کو پانی میں لیکر گیا، وہ اس کے ساتھ پانی میں گئے۔ جب ٹخنوں تک پانی تھا تو کوئی حرج نہیں، اور آگے لیکر گیا۔ جب گھٹنوں تک پانی میں چلے گئے، پھر بھی کوئی حرج نہیں، اور آگے لیکر گیا جب شیخ سعدی نے دیکھا کہ زانو تک پانی کے اندر چلے گئے ہیں، توازن بگڑنے لگا ہے اور ادھر ادھر ہلنے لگے تو انہوں نے اپنے محبوب سے کہا، السلام علیکم۔ بس : میرا عشق زانو تک ہی تھا اس سے آگے نہیں ؛ اب میں جاتا ہوں۔ جب سے یہ مثل مشہور ہو گیا کہ "عشق سعدی تا بہ زانو"

محبت کی حقیقت میرے دوستو: وہ کون سی محبت ہے جسکا مطالبہ اللہ اور اس رسول کی طرف سے کیا جاتا ہے؟ ہم نے محبت کا لفظ تو پڑھ لیا ہے لیکن شاید اس کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب اس کے تقاضے ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہم بھی وہی الفاظ دہرا دیتے ہیں جو شیخ سعدی نے کہا تھا کہ بھائی! تمہیں سلام۔ ہماری محبت تو بس یہیں تک ہے۔ اگر ہمیں محبت کرنا نہیں آتا ہے تو آیئے ؛ محبت کرنے والے عاشقوں اور دیوانوں سے سیکھیں کہ محبت کیسے کی جاتی ہے۔ انہی عاشقوں اور دیوانوں کے محبت کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی اس آیت میں بیان فرمایا ہے جسکی تلاوت میں نے خطبہ میں کی ہے۔

قرآن کریم کی یہ آیت ایک بڑی مشہور سورہ، سورہ توبہ کی ہے۔ یہ وہی سورۃ ہے جس کے شروع میں "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کی تلاوت نہیں کی جاتی ہے۔ حالانکہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ آیت رحمت ہے۔ اسی لئے شاہ عبد العزیز محدث دہلوی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ جب تم قرآن کریم کی تلاوت شروع کرتے ہو تو جس دروازہ سے اس میں داخل ہوتے ہو وہ دروازہ "باب رحمت" ہے۔ اس لئے کہ تم بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے قرآن کریم کی تلاوت شروع کرتے ہو، اور یہ آیت، آیت رحمت ہے۔ اور جس کے اندر داخل ہونے کا دروازہ ہی باب رحمت ہے تو اس کے اندر جاکر دیکھو کہ خدا کے کس قدر انعامات و اکرامات وہاں موجود ہیں۔

ایک لطیفہ آپ نے دیکھا ہوگا۔ ہندوستان کے اندر ایک زمانہ میں لوگ مکان تو چھوٹا سا بناتے تھے مگر اس کا دروازہ بہت شاندار بناتے تھے۔ جسکا نام رکھتے تھے "حویلی"۔ اندر کا حال تو کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا باقی باہر دروازہ بڑا شاندار ہوتا تھا۔ ایک ایسے ہی حویلی کے سامنے سے ایک سائل اور بھکاری کا گذر ہوا۔ اس نے جب دروازہ کو دیکھا تو کہنے لگا کہ آج تو مجھے بڑا شاندار دروازہ مل گیا ہے، آج مجھے اتنی بھیک یہیں سے مل جائے گی کہ شام تک مانگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس نے اس دروازہ پر جاکر آواز لگائی۔ اندر سے ایک عورت آئی اور ایک چٹکی آٹا دے دی۔ سائل حیران و پریشان ہوگیا۔ وہ بار بار اس شاندار دروازے کو دیکھتا تھا پھر اپنی بھیک کو دیکھتا تھا کہ یا اللہ! دروازہ اتنا شاندار ہے اور بھیک اتنی چھوٹی سی ہے۔ اسے غصہ آگیا، وہ گھر گیا اور ایک پھاوڑا لیکر آیا اور دروازے پر چڑھ کر اس کو گرانے لگا۔ مکان مالک بھاگتے ہوئے آیا اور کہنے لگا ارے میاں! یہ کیا بات ہے؟ ہمارے دروازے کو کیوں گرا رہے ہو؟ اس نے کہا: میاں دیکھو! یہ تمہارا دروازہ ہے اور یہ تمہاری بھیک ہے، دروازہ تو اتنا شاندار ہے لیکن بھیک بہت تھوڑی سی ہے۔ دیکھو! دو باتوں میں سے ایک بات تمہیں ضرور کرنی ہوگی۔

یا تو تم میری بھیک کو اپنے دروازے کے مطابق بنا دو ورنہ میں تمہارے دروازے کو اپنے بھیک کے مطابق بنائے دیتا ہوں!

سورہ توبہ کی شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ آیت رحمت ہے اور قرآن کریم کی تلاوت کی ابتداء اسی سے ہوتی ہے مگر فرمایا کہ اس سورہ (سورہ توبہ) کی ابتداء اس آیت سے نہیں ہونی چاہیے۔ کیوں؟ اس لئے کہ علماء نے لکھا ہے کہ اس سورہ کے اندر اللہ کے قہر کا، غضب کا اور ناراضگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور اس سورہ میں ان لوگوں کا بھی ذکر ہے جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی اور وعدہ خلافی کی ہے۔ جن کے بارے میں یہ حکم ہے کہ وہ جہاں ملیں قتل کردو۔ اگرچہ اسلام کی طرف سے جہاد اور قتال کی ضرورتاً اجازت ہے لیکن اس کی ظاہری شکل یہ ہوتی ہے کہ آپ کے ہاتھ میں تلوار ہے اور اس سے آپ کافروں کی گردن اڑا رہے ہیں، یہ عمل بظاہر دیکھنے میں عمل قہر ہے اس لئے فرمایا کہ جہاں خدا کے قہر و غضب کا اظہار ہو رہا ہو وہاں آیت رحمت تلاوت نہیں کی جانی چاہیے۔

جانور کو ذبح کرتے وقت صرف بسم اللہ اللہ اکبر کیوں پڑھا جاتا ہے اسی لئے علماء نے فرمایا کہ جب تم کسی حلال جانور کو ذبح کرو تو وہاں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مت پڑھو۔ میں نے جانور اس لئے کہدیا کہ بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جانور چاہے حلال ہو یا نہ ہو اگر ذبح کے وقت بسم اللہ پڑھ دیا جائے تو سب حلال ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اگر جانور نہیں ہے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کیا سارا قرآن بھی پڑھ کر اگر آپ ذبح کرینگے جانور تو حلال نہیں ہوگا البتہ کلامِ خداوندی کی توہین ہوگی تو علماء نے لکھا ہے کہ اگر آپ کو حلال جانور کو ذبح کرنا ہو تو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نہ پڑھیں، صرف اتنا کہیں "بسم اللہ اللہ اکبر" الرحمن الرحیم کہنا غلط ہے۔

اس لئے کہ آپ کے ہاتھ میں چھری ہے جسے آپ جانور کے گردن پر پھیر رہے ہیں۔اس کی جان جا رہی ہے تو اگر چہ اللہ کی طرف سے اس کی اجازت ہے لیکن یہ عمل۔ عمل قہر ہے۔ اور عمل قہر کے موقعہ پر آیت رحمت کی تلاوت نہیں کی جاتی ہے۔اس لئے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نہ کہو۔لیکن چونکہ اللہ کے نام پر ذبح کرنا ہے اس لئے "بسم اللہ اللہ اکبر" کہو۔

جانوروں کو بسم اللہ پڑھکر ذبح کرنے کی حکمت بعض لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ مولوی صاحب! جانور کو ذبح کرنے کیلئے اس کے گردن پر چھری پھیری جاتی ہے۔ پھر اس کے جسم سے خون نکلتا ہے۔ تو ذبح کرنے کے طریقے سے جب بھی اس کو ذبح کیا جائے تو جانور کو حلال ہونا چاہئے۔ اللہ کے نام لینے سے کیا فرق پڑجاتا ہے کہ اللہ کا نام لیا جائے تو حلال اور نہ لیا جائے تو حرام قرار دیا جاتا ہے؟ (۱) چاہے اللہ کا نام لیا جائے یا نہ لیا جائے ذبح تو اسی طریقہ پر ہوتا ہے، خون تو اسی طرح سے نکلتا ہے؟

اللہ تعالیٰ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو قبر میں کروٹ کروٹ آرام عطا فرمائے۔انہوں نے بڑی حکمت کی بات لکھی ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ اگر ایک انسان ترکاری، سبزی اور پھل توڑ کر لاتا ہے تو اس کو کھانے کے واسطے کاٹنے کے وقت بسم اللہ اللہ اکبر پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بغیر اس کا کھانا جائز ہے۔اسکی وجہ یہ ہے کہ انسان جاندار مخلوق ہے اور وہ جاندار مخلوق نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ نے اسکو انسان کیلئے غذا بنایا ہے لہذا اس کو کھانے کیلئے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن مرغی، بکرے اور گائے کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ بھی جاندار مخلوق ہے اور انسان بھی جاندار مخلوق ہے۔ انسان کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس کو غذا بنائے۔ اس لئے انسان اس وقت تک کسی جاندار مخلوق کو غذا نہیں بنا سکتا جب تک کہ اس کو

(۱) رد المختار، کتاب الذبائح ۹/ ۴۳۰۔ الفتاوی الھندیہ ۶/ ۲۸۶

پیدا کرنے والے خالق سے اجازت نہ لے لے۔ حضرت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ جو شخص اللہ کا نام لیکر جانور کو ذبح کرتا ہے گویا وہ پیدا کرنے والے سے اجازت لیکر ذبح کر رہا ہے۔ اس سے اس کا کھانا حلال ہوگا اور اگر اللہ کا نام نہیں لیا گیا تو گویا اس کے خالق سے اجازت لئے بغیر اسکو ذبح کیا گیا ہے لہذا اسکا کھانا حرام ہوگا۔ بہرحال یہ سورہ (سورۃ توبہ) قرآن کریم کی وہ سورہ ہے جس میں آیت رحمت نازل نہیں ہوئی۔ اسی سورۃ میں وہ واقعہ بیان کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ واقعۃً محبت کس کو کہتے ہیں۔

آجکل محبت کا دم بھرنے	نہ لگے مہندی نہ گھسے پھٹکری مگر رنگ آئے پختہ

والے تو بہت ہیں لیکن اس کا تقاضہ پورا کرنا کوئی نہیں چاہتا مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک صاحب تھے، جنکو یہ شوق تھا کہ اپنے ہاتھ پر شیر کی تصویر بنوائیں۔ چنانچہ انہوں نے تصویر بنانے والے کو بلایا؟ جب وہ آدمی اوزار لیکر آیا اور اس کے ہاتھ پر شیر کی تصویر بنانے کیلئے سوئی گرم کرکے لگائی تو وہ بڑے زور سے چلّایا کہ ہائے! کیا ہوا؟ اور کہنے لگا یار! یہ کیا بنا رہے ہو؟ مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ اس نے کہا ارے بھائی! تم نے کہا تھا شیر بناؤ۔ میں شیر بنا رہا ہوں! وہ کہنے لگا: بھائی شیر تو بنا رہے ہو ٹھیک۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ شروع کہاں سے کئے ہو؟ تصویر بنانے والے نے کہا۔ دُم کی طرف سے شروع کیا ہوں۔ کہنے لگا۔ یار! بلا دُم کے بھی تو شیر ہوتا ہے۔ دُم بنانے میں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے اس لئے دُم نہ بنا۔ شیر بنا دے۔ اس نے کہا۔ بہت اچھا! میرا کام کم ہوگیا۔ اس نے پھر سوئی رکھی تو پھر یہ چلّایا اور کہنے لگا کہ اب کیا بنا رہا ہے؟ اس نے کہا۔ سر بنا رہا ہوں۔ وہ کہنے لگا یار! سر بنانے میں بھی بڑی تکلیف ہو رہی ہے اس لئے سر نہ بنا۔ شیر بنا دے۔ بلا سر کا بھی تو شیر ہوتا ہے! اسی طرح وہ کہتا رہا کہ پیٹ نہ بنا۔ شیر بنادے۔ ٹانگیں نہ بنا۔ شیر بنادے۔ کان نہ بنا۔ شیر بنادے۔ مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تصویر بنانے والے نے اپنے اوزار پھینک دیئے اور کہنے لگا ۔

شیر بے دُم و سر و اشکم کہ دید
ایں چنیں شیرے خدا ہم نا فرید

ارے ظالم: ایسا شیر میں تیرے ہاتھ پر کیسے بنادوں کہ دُم نہ ہو اور شیر ہو، کمر نہ ہو اور شیر ہو، ٹانگیں نہ ہوں اور شیر ہو؟ ایسا شیر تو خدا نے بھی پیدا نہیں کیا ہے تو میں تیرے ہاتھ پر کہاں سے بنادوں؟ آج مسلمان بھی یہی چاہتا ہے کہ ہم اللہ اور اللہ کے رسول کے عاشق کہلائیں، محبت کرنے والے کہلائیں لیکن ہمارے اوپر سوئی نہ رکھی جائے۔

جنگ تبوک ایک نمونہ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سی محبت ہے جسکا مطالبہ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے ہے؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ ایک جہاد میں تشریف لے جارہے ہیں اور یہ آپ ﷺ کا آخری جہاد ہے۔ کیونکہ ۸ھ میں آپ نے مکہ فتح کیا ہے اور ۹ھ کے اندر یہ جہاد پیش آیا ہے۔ جسکا نام غزوہ تبوک ہے تبوک مدینہ اور شام کے درمیان ایک بستی ہے جو مدینہ سے دور ہے اور شام سے قریب ہے۔ اس زمانے میں مدینہ اور شام کے درمیان زیتون کی تجارت ہوا کرتی تھی، تو شام سے ایک تاجر مدینہ آیا اور حضور ﷺ کے پاس جاکر یہ کہنے لگا کہ یارسول اللہ ﷺ! روم سے ایک بہت بڑا لشکر آیا ہے جو شام میں ٹھہرا ہوا ہے اس کی تعداد تقریباً چالیس ہزار ہے۔ قیصر روم کو کسی نے یہ خبر دے دی ہے کہ (نعوذ باللہ) پیغمبرِ اسلام کا انتقال ہوچکا ہے اور مدینہ کے مسلمان غربت اور قحط کی وجہ سے پریشان حال ہیں۔ بس ایک حملہ کافی ہے۔ ہمیشہ کیلئے ان کا مسئلہ ختم ہوجائے گا۔ اس لئے وہ لوگ مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں اسی بات کی خبر دینے کیلئے آپ کے پاس آیا ہوں۔

حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو جمع کیا اور فرمایا کہ جہاد کیلئے تیاری شروع کردو۔ اور سن لو! میری یہ عادت نہیں ہے کہ میں اس جگہ کا نام بتادوں جہاں ہمیں

جہاد کیلئے جانا ہے لیکن آج میں وہ جگہ بتادے رہا ہوں کہ ہمیں تبوک کی طرف جانا ہے۔ اس لئے کہ اس وقت ہم انتہائی تنگی کے دور سے گذررہے ہیں، غربت وافلاس کے دور سے گذررہے ہیں، پچھلے سال ہماری پیداوار خراب ہوگئی تھی اس لئے ہم قحط میں مبتلا ہیں اور جہاں جہاد کیلئے جانا ہے وہ جگہ بہت دور ہے اور موسم بھی بہت گرم ہے اس لئے ضروری تھا کہ میں آپ لوگوں کو اس جگہ کا نام بتادوں تاکہ جتنی تیاری کر سکتے ہو کرلو۔ (۱)

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور شوق شہادت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فوراً تیاری شروع کردی۔ اس لئے کہ ان کی نظروں میں اس سے زیادہ مزیدار دنیا میں کوئی چیز نہیں تھی کہ اللہ ان کو شہادت عطا فرمائے۔ غزوہ احد میں ایک صحابی شہید ہوگئے۔ کافروں نے ان کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک، سب کاٹ کر مُثلہ بنادیا۔ ان کے صاحبزادے حضور اکرم ﷺ کے پاس اداس کھڑے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا۔ تم خاموش کیوں کھڑے ہو؟ کیا باپ کی لاش کو دیکھ کر تمہیں صدمہ پہنچا ہے؟ انہوں نے کہا، مجھے باپ کے شہید ہوجانے کی وجہ سے کوئی صدمہ نہیں ہوا لیکن ان کی جو حالت بنادی گئی ہے اسے دیکھ کر تکلیف ہورہی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے باپ کی اللہ سے کیا گفتگو ہوئی اور تمہارے باپ نے کیا کہا؟ انہوں نے کہا، مجھے نہیں معلوم یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے والد سے یہ کہا کہ تم ہمارے راستے میں اتنی بڑی قربانی دیکر آئے ہو کہ تمہارے آنکھ، ناک، کان، سب کٹ گئے ہیں لہذا مانگو کیا مانگتے ہو؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، تم جانتے ہو کہ پھر تمہارے والد نے کیا کہا؟ انہوں نے کہا، مجھے نہیں معلوم یارسول اللہ ﷺ! سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا تمہارے والد نے یہ کہا کہ اے اللہ! میں کچھ نہیں چاہتا،

(۱) بخاری شریف، کتاب المغازی / ۴۰۶۶۔ مسلم شریف / ۴۹۰۳ ترمذی / ۳۰۲۷ ابوداؤد / ۱۸۸۳۔ مسند احمد / ۱۵۲۱۰

میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے دوبارہ دنیا کی زندگی عطا کی جائے تاکہ میں اسی طرح دوبارہ لذت شہادت حاصل کرسکوں۔

آپ نے اندازہ لگایا کہ ایک صحابی کو شہادت کے اندر کتنی لذت ملتی تھی۔

اور کیوں نہ ملے جبکہ خود سرکار دو عالم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں۔

والذی نفسی بیدہ لوددت انی اقتل فی سبیل اللہ ثم احی اقتل ثم احی ثم اقتل ثم احی ثم اقتل (۱)

آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میری تمنا اور میری خواہش یہ ہے کہ میں اللہ کے راستے میں قتل کیا جاؤں، پھر (لذت شہادت کی خاطر) مجھے دوبارہ زندہ کیا جائے پھر شہید کیا جائے، پھر زندہ کیا جائے پھر شہید کیا جائے، پھر زندہ کیا جائے پھر شہید کردیا جائے۔

صدیق اکبر کا مقام تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ مسلمان غزوہ تبوک کیلئے تیاری کرنے لگے۔ یہی وہ موقعہ ہے کہ جب آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ تم جہاد کیلئے کیا لیکر آئے ہو اور اپنے گھر میں کیا چھوڑ کر آئے ہو تو انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! گھر میں جو کچھ تھا وہ سب لے آیا ہوں اور گھر میں اللہ اور اس کے رسول کے نام کو چھوڑ آیا ہوں۔ اسی موقعہ پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں ہمیشہ سے یہ چاہتا تھا کہ ابوبکر صدیقؓ سے آگے بڑھ جاؤں اور اس کیلئے یہ بہترین موقعہ تھا لیکن اب میں سمجھ گیا کہ میں ابوبکر صدیقؓ سے کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ (۲)

دیکھا آپ نے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر اس بات کی بھی حرص تھی کہ ہم ایک دوسرے سے آگے بڑھ جائیں اور آج ہمارے اندر بھی یہ حرص ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ صحابہ کرام میں اس بات کی حرص تھی کہ ہم میں سے کون زیادہ تلاوت قرآن کرتا ہے؟ ہم میں سے کون زیادہ روزے رکھتا ہے؟ ہم میں سے کون زیادہ نوافل پڑھتا

(۱) رواہ البخاری ج۱/ ۲۵۸۸، مسلم/ ۳۴۸۴، النسائی/ ۳۰۷۱ (۲) سنن ترمذی، المناقب/ ۳۵۹۴، احمد/ ۱۳۳۔

ہے؟ اور ہمارے اندر جو حرص ہے۔ ہمارے اندر جو دوڑ ہے وہ اس بات کی ہے کہ کس کا بینک بیلنس (BANK BALANCE) زیادہ ہے۔ تو ہماری حرص اور ہماری دوڑ جو ہے وہ دیوانوں اور پاگلوں کی دوڑ کی طرح ہے کہ کس طریقہ سے ہماری دولت میں اضافہ ہو جائے۔

ایک لالچی کی حکایت ایک حکایت یاد آگئی۔ عربی کتابوں میں میں نے پڑھا ہے کہ ایک لالچی تھا جسکا نام "اشعب" تھا اور لقب "طماع"۔ اس کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ جب وہ گھر سے نکلتا تھا تو بچے اسے چھیڑا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ کہیں جا رہا تھا کہ بچوں نے اس کو گھیر لیا، اس نے بچوں سے پیچھا چھڑانے کیلئے کہا کہ ارے مجھے کیوں چھیڑ رہے ہو سالم بن عبداللہ بن عمرؓ کے گھر جاؤ وہ کھجوریں بانٹ رہے ہیں۔ سارے بچے کھجور لینے کیلئے دوڑے، اب اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ کہیں واقعی کھجور نہ بٹ رہے ہوں اس لئے پیچھے سے یہ بھی دوڑا۔

تو معاف کیجئے آج ہمارا حال بھی اشعب طماع کی طرح ہی ہے۔ آج نیک کام کرنا بڑا مشکل ہے اور برائی میں ملوث ہونا انتہائی آسان ہے۔ آج برائی کے لئے ہر وقت ماحول ساز گار ملتا ہے جبکہ نیکی کیلئے کبھی ماحول ساز گار نہیں ہوتا۔ میرے بچپن کا زمانہ مجھے یاد ہے۔ میرے چار بھائیوں میں سے سب نے اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کی لیکن اس زمانے میں یہ تعلیم دلانے کیلئے میرے والد صاحب کو بڑی مشکلات پیش آتی تھیں۔ ہر جگہ انگریزی تعلیم کا انتظام میسر نہیں تھا۔ اور آج میں نے یہ دیکھا ہے کہ ہر جگہ انگریزی تعلیم کا ماحول اور انتظام ہے اور ایک زمانہ میں اللہ کے دین کو سیکھنے کیلئے بڑی سہولتیں تھیں لیکن آج اسکا سیکھنا بڑا مشکل ہے۔ آج کی دنیا میں کافی سہولتیں ہیں۔ لیکن اگر کوئی مسلمان مسافر سفر کرے تو اس کو نماز پڑھنے کیلئے بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔

منافقین کی فریب کاری تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حضور اکرم ﷺ نے صحابہ

کرام کو غزوہ تبوک کیلئے تیاری کا حکم دے دیا۔ ادھر مدینہ کے اندر بہت سے منافقین موجود تھے۔ مدینہ منافقوں کا مرکز تھا۔ اس لئے کہ یہاں پر یہودیوں کی بڑی تعداد آباد تھی۔ ان لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی طاقت روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے تو اپنے کفر کو چھپاتے ہوئے اسلام قبول کرلیا اور مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھنی شروع کردی۔ لیکن آج جب جہاد کا حکم ہوا تو ان لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ ہم نماز پڑھنے تو چلے جاتے ہیں اس لئے کہ وہ آسان ہے لیکن جہاد میں اپنی گردن کٹوانے کو جائے گا؟ اس لئے یہ لوگ مسلمانوں کے پاس گئے اور کہا کہ دیکھو! تم نے دنیا کی ساری قوموں سے مقابلہ کیا ہے لیکن اب تک رومیوں سے مقابلہ نہیں کیا ہے۔ وہ بڑی طاقتور اور لڑنے میں ماہر قوم ہے لہٰذا اب اگر تم رومیوں کے مقابلہ پر گئے تو بچ کر واپس نہیں آسکو گے۔ صحابہ نے کہا۔ آپ لوگ مجھے کیوں ڈرا رہے ہیں؟ کس چیز کی دھمکی دے رہے ہیں؟ ارے! وہ کون نالائق ہے جو بچنے کی نیت سے جہاد کیلئے جاتا ہے؟ ہم تو شہادت کی نیت سے جہاد میں جارہے ہیں! یہ بات جو آج تم ہمیں کہہ رہے ہو اسے ہم پہلے سے ہی سمجھ رہے ہیں! حضرت تھانویؒ کے خلیفہ حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کا ایک شعر یاد آگیا۔ فرمایا کہ ؎

یہ سب سوچ کر دل لگایا تھا ناصح

نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں

منافقین نے کہا، اچھا دیکھو! دوسری بات سنو! پچھلے سال تمہاری فصلیں تباہ ہوچکی ہیں، اب تمہاری فصلیں تیار کھڑی ہیں، اگر ایسی حالت میں تم جہاد کیلئے چلے گئے تو پھر اس سال تمہیں قحط کا سامنا کرنا پڑے گا۔۔۔۔ میں نے کہا نا کہ شیطان بڑا اسکیمر (SCHEMER) ہے۔ بڑی بڑی اسکیمیں اور بڑے بڑے منصوبے سامنے لاتا ہے۔ بس ہمت ہو تو اسکا مقابلہ کرو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا کہ بے شک ہماری فصلیں تیار کھڑی ہیں لیکن ہمارا یہ ایمان ہے کہ اگر ہم اللہ کیلئے نکلیں گے تو اللہ ہماری فصلوں کی

حفاظت فرمائے گا۔ نہ ہمیں اپنی جانوں کی پرواہ ہے۔ نہ اپنی فصلوں کی پرواہ ہے ہمیں تو جہاد میں جانا ہے۔

چنانچہ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام جہاد کیلئے روانہ ہو گئے۔ اور منافقین اپنے گھروں میں بیٹھ گئے اور بعض صحابہ بھی جہاد میں جانے سے رہ گئے۔ ادھر جب رومی لشکر کو معلوم ہوا کہ ہمیں غلط خبر ملی تھی، رسول اللہ ﷺ بھی باحیات ہیں اور اسلامی لشکر لڑنے کیلئے تیار بھی ہے تو وہ لوگ شام سے ہی واپس چلے گئے۔ حضور اکرم ﷺ جب وہاں تشریف لے گئے اور پتہ چلا کہ رومی لشکر بھاگ گیا ہے تو بغیر جہاد کے واپس لوٹ آئے۔

جب آپؐ مدینہ تشریف لے آئے تو منافقین میں سے کسی نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی، کسی نے اپنے آپ کو لنگڑا بنا لیا اور کوئی چادر وغیرہ اوڑھ لیا اور حضورؐ کے پاس آکر جھوٹا عذر بیان کرنے لگے۔ کسی نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! مجھے آنکھ میں چوٹ لگ گئی تھی اس لئے میں نہیں آسکا۔ کسی نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ! میں گر گیا تھا میرے پاؤں میں چوٹ لگ گئی تھی اس لئے میں نہیں آسکا۔ کسی نے کہا، یا رسول اللہؐ! مجھے بخار ہو گیا تھا اس لئے میں نہیں آسکا۔ حضور اکرم ﷺ یہ تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور ان کے جھوٹے اعذار کو قبول فرماتے جا رہے ہیں۔

تین صحابی کی جنگ میں عدم شرکت ان کی ندامت اور توبہ

بعض جلیل القدر صحابہ بھی شریک جہاد نہیں ہوئے تھے، وہ تین صحابی تھے، حضرت کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور حضرت بلال بن امیہ رضی اللہ عنہم (۱)۔ انہیں تینوں کے توبہ کی قبولیت کی خوشخبری اس سورہ میں سنائی گئی ہے، جسکی وجہ سے اس سورہ کا نام "سورہ توبہ" رکھا گیا ہے۔ قبولیت توبہ سے قبل ان تینوں کی حالت عجیب تھی۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ

(۱) صحیح مسلم / ۴۹۰۳، ترمذی / ۳۰۲۰، نسائی / ۳۰۶۳، سنن ابی داؤد / ۱۸۸۳، مسند احمد / ۱۵۲۱۰

حضور اکرم ﷺ کے پاس تشریف لائے اور روزانہ کی طرح سلام کیا۔ حضور اکرم ﷺ نے جواب دیا مگر آج کے جواب سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو محسوس ہو گیا کہ رسول اللہؐ ناراض ہیں۔ کیونکہ محبت ایک ایسی چیز ہے کہ اگر اس میں بال برابر بھی فرق آجاتا ہے تو عاشق کو محسوس ہو جاتا ہے۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ عاشق صادق تھے اس لئے بے چین ہو گئے۔ کہنے والے نے سچ کہا۔ فرمایا کہ ؎

ہم نے الفت کی نگاہیں دیکھیں
جانیں کیا چشم غضبناک کو ہم

ہم نے تو ہمیشہ حضور اکرم ﷺ کو پیار کرتے ہی دیکھا ہے۔ ناراضگی تو ہم نے کبھی نہیں دیکھی۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بے چین ہو کر سوچنے لگے کہ اگر میں بھی ان منافقین کی طرح جھوٹی باتیں کہہ کہ عذر پیش کردوں تو کیسا رہے گا؛ لیکن دفعتہً یہ خیال آیا کہ رسول اللہؐ کے ساتھ غلط بیانی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر میں کوئی غلط بات کہہ کر بچنے کی کوشش کروں گا تو فوراً اللہ کی وحی انکو صحیح بات بتادے گی۔ جھوٹ تو وہاں بولے جہاں چل جائے۔ یہاں تو نہیں چل سکتا۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا یا رسول اللہ ﷺ! میرے جہاد میں شریک نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ بس اتنی سی بات تھی کہ میرے پاس اپنی سواری تھی اور میرا یہ خیال تھا کہ لشکر آہستہ آہستہ جارہا ہے اور میری سواری تیز رفتار ہے لہذا میں کل نکلوں گا اور لشکر سے مل جاؤں گا۔ پھر کل ہو کر یہی خیال آتا تھا۔ اسی آج کل میں یارسول اللہ ﷺ! میں رہ گیا یہاں تک کہ آپ واپس تشریف لے آئے۔ بس! یہی بات ہے۔ میرے پاس کوئی اور عذر نہیں ہے۔

تینوں حضرات صحابہ سے بائیکاٹ کا حکم

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ

مسلمانو! غور سے سن لو! اللہ کا حکم یہ ہے کہ کعب ابن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ کا جو جہاد میں شریک نہیں ہوئے ہیں مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔ لہٰذا جب تک اللہ کی طرف سے ان لوگوں کی معافی کا اعلان نہ ہو جائے اس وقت تک کوئی مسلمان ان کے ساتھ سلام کلام، بات چیت نہ کرے۔ بس اس کے بعد جو حالات پیش آئے اسی کا منظر میں آپ لوگوں کو دکھانا چاہتا ہوں۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی نگاہیں کیا پھریں معلوم ہوا کہ زمین بھی پھر گئی آسمان بھی پھر گیا۔ وہی مسلمان جو ہمارے عزیز اور ہمارے دوست تھے آج سلام کا جواب بھی نہیں دیتے تھے، کوئی ہم تینوں سے بات نہیں کرتا تھا۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ روتے روتے ہمارا بُرا حال ہو گیا۔ کیوں؟ فرمایا کہ

من سایہ ترنی پسندم
عشق است وہزار بد گمانی

عاشق کہتا ہے کہ مجھے تو یہ اطمینان ہے کہ میرے محبوب کے ساتھ کوئی آدمی نہیں چل رہا ہے لیکن جب وہ دھوپ یا روشنی میں چلتا ہے تو اس کے ساتھ اسکا سایہ بھی چلتا ہے، مجھے اس سایہ پر بھی رشک آتا ہے کہ یہ میرے محبوب کے ساتھ کیوں چل رہا ہے؟

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ خیال رہ رہ کر ستاتا تھا کہ مجھ سے رسول اکرم ﷺ ناراض ہیں اگر اسی حالت میں مجھے موت آ گئی تو حضورؐ میری جنازہ کی نماز نہیں پڑھائیں گے اور وہ کتنا بد بخت آدمی ہو گا کہ جسکا انتقال رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہو اور رسول اللہؐ اس کے جنازہ کی نماز نہ پڑھائیں۔ اور کبھی یہ خیال آتا تھا کہ اگر اسی حالت میں حضور اکرم ﷺ دنیا سے تشریف لے جائیں تو پھر ہم کس

کے پاس جائیں گے؟ اور کس سے گڑگڑا کر معافی مانگیں گے؟ پوری زندگی ہمیں اسی حالت میں گذارنی پڑے گی۔

اپنے ہوئے بیگانے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ روتے روتے ہمارا برا حال ہوگیا تھا، میرا ایک بھتیجا تھا جسکا نام قتادہ تھا، اس پر میں نے بڑے احسانات کئے تھے، میں نے سوچا کہ اگرچہ کوئی مسلمان ساتھ نہیں دیتا لیکن چونکہ قتادہؓ پر میرے بڑے احسانات ہیں اس لئے وہ ضرور ساتھ دے گا۔ چنانچہ میں اس کے پاس پہنچا اور سلام کیا، قتادہ رضی اللہ عنہ نے جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا، اے قتادہ رضی اللہ عنہ! سچ سچ بتانا! کیا تیرے اوپر میرے احسانات نہیں ہیں؟ اس نے کہا، آپ کے احسانات میرے اوپر ضرور ہیں لیکن محسن اعظم سرکار دوعالم ﷺ جب تک آپ سے ناراض رہیں گے میں آپ کی طرف چہرہ بھی نہیں پھیروں گا۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ روتے ہوئے واپس آگئے۔ گھر پر دیکھا کہ بیوی اپنا سامان باندھ رہی ہے، انہوں نے کہا، بیگم! تم کہاں جارہی ہو؟ مجھے پتہ چلا کہ سرکار دوعالم ﷺ آپ سے ناراض ہیں، اور جب تک رسول اللہ ﷺ آپ سے ناراض رہیں گے میں آپ کے گھر میں رہنا پسند نہیں کرتی۔

میرے دوستو! دیکھا آپ نے؟ محبت رسول کے سامنے شوہر و بیوی کی محبت، عزیز و اقارب کی محبت، دوست و احباب کی محبت سب ہیچ ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کی مرضی کا سوال آجائے کہ رسول اللہ ﷺ کس بات سے راضی ہیں اور کس بات سے ناراض ہیں تو پھر درمیان میں دنیا کی کسی چیز کی محبت کے آڑے آنے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی کا نام محبت رسول ہے!

ڈاڑھی پر استرہ چلانا حضور ﷺ کے دل پر استرہ چلانا ہے دہلی میں ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک شاعر تھا، اور بعض کا دل رقیق ہوتا ہے وہ شاعر بھی ایسا ہی تھا، اس

کے کلام میں تصوف کی چاشنی تھی، سوز و گداز تھا، حالانکہ تصوف سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، ایک شخص نے جب اس کے اشعار کو دیکھا تو کہنے لگا کہ یہ کوئی بڑا اللہ والا درویش معلوم ہوتا ہے، اسکی بزرگی کا معتقد ہو گیا، یہاں تک کہ وہ اسکی زیارت کیلئے ایران سے سفر کرکے دہلی آیا۔ اور دہلی آکر اس نے لوگوں سے پوچھا کہ فلاں نام کے ایک بزرگ ہیں وہ کس خانقاہ میں رہتے ہیں؟ لوگوں نے کہا، ارے! خانقاہ وانقاہ کچھ نہیں، وہ تو ایک شاعر ہے جو فلاں گلی میں رہتا ہے: جب یہ وہاں گیا تو دیکھا کہ یہ صاحب چارپائی پر بیٹھے ہوئے حجام سے ڈاڑھی منڈوا رہے ہیں۔ یہ تو اس کو ولی اللہ سمجھ کر اپنا گھربار چھوڑ کر آیا تھا لیکن جب یہ حالت دیکھی تو اس سے رہا نہ گیا، کہنے لگا، آغا! ریش می تراشی ارے ظالم! تجھے پتہ نہیں کہ میں تجھے کیا سمجھ کر آیا ہوں لیکن تو ڈاڑھی منڈا رہا ہے؟ تو جیسا کہ آجکل کے نوجوان جواب دیتے ہیں اسی طرح اس نے بھی جواب دیا، اس نے کہا، بلے ریش می تراشم و لے دل کسے نمی خراشم: ارے صاحب! میں اپنے گلے چھیلتا ہوں، کسی کا دل نہیں چھیلتا؟ اس نے کہا، تو یہ کیا کہہ رہا ہے کہ میں کسی کا دل نہیں چھیلتا ہوں۔ بلے دلِ رسول می خراشی ارے! تم اپنی اس حرکت سے حضورؐ کا دل دکھا رہے ہو۔ یعنی جب تیرا یہ عمل رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا جاتا ہوگا تو حضور کا دل کس قدر دکھتا ہوگا۔ لکھا ہے کہ یہ سنتے ہی اس کی آنکھیں کھل گئیں اور فوراً کھڑا ہو گیا۔ جتنی داڑھی منڈ گئی تھی وہ منڈ گئی باقی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور ایک وجد کی سی کیفیت اس پر طاری ہو گئی اور جوش میں آکر یہ کہا ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی

مرا با جانِ جاناں ہمراز کردی

خدا تیرا بھلا کرے، مجھے پتہ نہیں تھا، میں اتنے دنوں سے رسول اللہ ﷺ کا دل دکھا رہا تھا، آج تم نے مجھے رسول اللہؐ سے ملا دیا۔ آپ نے اندازہ لگایا؟ محبت رسول کا

مطلب یہ ہے کہ سارا جذبہ اور سارا شوق سرکار دوعالم ﷺ کی محبت پر قربان کردیا جائے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ارشاد میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی دیکھو! چپکنے چپکنے کلے ہمیں بھی اچھے لگتے ہیں مگر جب سے رسول اللہ ﷺ کا حکم ہمارے سامنے آیا ہے پھر اس حکم کے سامنے ہمارا کوئی شوق، شوق نہیں ہے، کوئی احساس، احساس نہیں ہے۔

اللہ کا پیغام تینوں صحابہ کے نام

بہر حال! اللہ تعالیٰ نے ان تینوں صحابیوں کی توبہ قبول فرمائی اور اس سلسلہ میں قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی۔ فرمایا کہ

لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ سُوْرَةُ التَّوْبَة

سرکار دوعالم ﷺ نے ایک صحابی کو بھیجا کہ جاؤ کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم، ان تینوں کو خبر دے دو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرلی ہے۔

سبحان اللہ! وہی مسلمان جو ان کے سلام کا جواب نہیں دیتے تھے، بول چال نہیں کرتے تھے، آج اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ان کو اپنے سروں پر بٹھا رہے ہیں۔

اپنے سینوں سے لگا رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے دلوں میں تم سے کوئی بغض نہیں تھا، کوئی نفرت نہیں تھی لیکن رسول اللہ کے حکم کے آگے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اور جب آج اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ مرتبہ دیا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرتے ہوئے قرآن کریم میں آیتیں نازل فرمادی ہیں تو اب تم ہماری آنکھوں کے تارا ہو، تم ہماری عزت ہو، اب ہم تمہیں اپنے سروں پر بٹھانے کیلئے تیار ہیں۔

حاصل کلام محبت وہ نہیں ہے جو ہم اور آپ کرتے ہیں، محبت وہ ہے جو کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے کرکے دکھائی، جو ان کی بیوی نے کرکے دکھائی، جو ان کے بھتیجے نے کرکے دکھائی کہ جب خدا اور خدا کے رسول کا معاملہ آجائے تو پھر کسی کی محبت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میرے دوستو! یہ قران کریم کی اس آیت کی تفسیر تھی۔ جو میں نے خطبہ میں تلاوت کی تھی۔

حاصل یہ ہے کہ جب ہمارے اور آپ کے دلوں میں اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت پیدا ہوگی تو اسکی وجہ سے انشاء اللہ ہمارے دلوں میں نور پیدا ہوگا، اور ہماری ساری بیماریاں آہستہ آہستہ ختم ہوجائیں گی۔

اب میں آپ سے معذرت چاہوں گا، دعا کیجئے کہ اے اللہ ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ہمارے دلوں میں سرکار دوعالم ﷺ کی محبت پیدا فرما۔ اے اللہ ہمیں حضورؐ کی نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه

وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه۔ اللھم

صلی علی سیدنا ومولینا محمد صلوة تنجینا

بھا من جمیع الاھوال والافات۔ وتقضی لنا بھا جمیع

الحاجات۔ وتطھرنا بھا من جمیع السیئات۔ وترفعنا

بها اعلی الدرجات. وتبلغنا بها اقصی الغایات.

من جمیع الخیرات فی الحیوۃ وبعد الممات.

انک علی کل شئی قدیر برحمتک

یاارحم الراحمین والحمد للہ رب العلمین



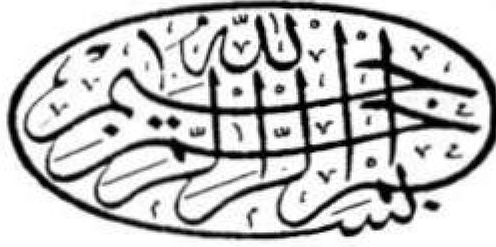
شانِ بعثت

خلاصہ مضمون شانِ بعثت

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی پیدائش کیلئے سب سے اعلیٰ خاندان، عمدہ ترین جگہ اور موزوں و مناسب زمانہ کا انتخاب فرمایا۔ آپؐ کی پیدائش کیلئے روئے زمین کے اس مقام کو منتخب فرمایا جو دنیا کی ساری آبادی کا مرکزی اور محوری حصہ ہے، مرکز عالم ہے۔ اور وہ مکہ ہے۔ اگر آپ دنیا کا نقشہ لیکر بیٹھیں تو معلوم ہوگا کہ روئے زمین کے جس حصہ پر بیت اللہ ہے وہ حصہ پوری دنیا کا مرکزی اور بیچ کا حصہ ہے، اور اس میں حکمت یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کو حضور اکرم ﷺ کے ذریعہ ساری دنیا کے انسانوں تک پیغام پہنچانا تھا اس لئے آپ کی پیدائش کیلئے مرکزی مقام ہی مناسب تھا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے درود مسعود کیلئے ایسے خاندان کا انتخاب فرمایا کہ روئے زمین پر آدم علیہ السلام کی اولاد میں سب سے افضل، اعلیٰ وارفع خاندان تھا، اور وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا خاندان ہے جو آگے چل کر قریش کہلایا۔

(ارشاد حضرت خطیب الامتؒ)





اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحٰبِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

اَمَّا بَعْدُ۔ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٨﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾ سورۃ البقرۃ

صَدَقَ اللّٰہُ مَوْلَانَا الْعَظِیْمُ وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ
وَنَحْنُ عَلٰی ذٰلِکَ مِنَ الشَّاھِدِیْنَ وَالشَّاکِرِیْنَ
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

گذشتہ سے پیوستہ بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! میں نے گذشتہ جمعہ جو ربیع الاول کا پہلا جمعہ تھا قرآن کریم کی ان آیتوں کی تلاوت کی تھی جن میں حضور اکرم ﷺ کی تشریف آوری، آپ کی بعثت اور آپ کی ولادت کیلئے دعا مانگی گئی تھی۔ ولادت کے معنی ہیں پیدائش کے اور بعثت کے معنی ہیں نبی اور رسول بنا کر بھیجنا۔

قرآن کریم میں جگہ جگہ سرکار دوعالم ﷺ کی تشریف آوری کا ذکر لفظ بعثت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں گذشتہ جمعہ میں نے عرض کیا تھا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام باپ بیٹے، جو دونوں کے دونوں حضور ﷺ کے آباء واجداد میں سے ہیں، جب خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے اس مبارک وقت میں ان دونوں نے چند دعائیں مانگیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام دعاؤں کو قبول فرمایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا کیا مانگا ایک دعا تو یہ تھی اے اللہ! ہم جو یہ

خدمت کر رہے ہیں، پتھر ڈھو ڈھو کر لارہے ہیں اور چُنائی (جوڑائی) کر رہے ہیں۔ اس خدمت کو قبول فرمالے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمایا اور ساری دنیا کے مسلمانوں کیلئے اسکو مرکز اور اجتماع کی جگہ بنایا۔ پھر یہ دعا مانگی۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ

اے اللہ! ہم دونوں کو اپنا وفادار رکھئے، باغی اور گنہگار نہ ہونے دیجئے، اور ہماری نسل اور ہماری اولاد کو بھی اپنا تابعدار، مطیع اور فرمابزدار بنایئے۔

اسی کے ساتھ ساتھ اپنی اولاد کیلئے یہ دعا بھی فرمائی وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ ہماری اولاد کو خوشحالی بھی عطا فرما، اور آخر میں حضور اکرم ﷺ کی تشریف آوری اور بعثت کے متعلق دعا مانگی۔

در رسولؐ میں جرات مندانہ سوال قبیلہ بنو عامر کا ایک بوڑھا آدمی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا۔ یہ وہی قبیلہ ہے جس قبیلہ کا مجنون تھا جسکے قصہ کو ہم لیلیٰ مجنون کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسکا اصل نام قیس تھا، قبیلہ بنو عامر کے ہونے کی وجہ سے قیس عامری کہلاتا تھا، تو قبیلہ بنو عامر کا ایک بوڑھا آدمی حضور ﷺ کی مجلس میں آیا اور کہنے لگا کہ اگرچہ میں مسلمان نہیں ہوں لیکن آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ سے کچھ سوالات کروں۔ حضور اکرم ﷺ نے نہایت خندہ پیشانی سے اجازت دے دی کہ سوال کرو! اس نے کہا، میرا پہلا سوال یہ ہے کہ آپ نے پیغمبری کا اعلان کیا ہے، اور ہر نبی اور پیغمبر کے نبوت کی ایک بنیاد ہوتی ہے۔ آپ کی نبوت کی بنیاد کیا ہے؟

دعاءِ خلیل اور نوید مسیحا حضور اکرم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا

انا دعوة ابراهيم وبشارة عيسى عليهما الصلوة والسلام (۱)

(۱) تفسیر ابن کثیر سورہ بقرہ آیت / ۱۲۹۔ د تفسیر قرطبی سورہ صف آیت / ۶

فرمایا کہ میری نبوت کی ایک بنیاد نہیں بلکہ دو بنیادیں ہیں؛ ایک بنیاد تو یہ ہے کہ آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا مانگی تھی میں اسی دعا کا نتیجہ ہوں، وہ دعا میرے لئے ہی مانگی گئی تھی۔

معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا میں جس نبی اور پیغمبر کی بعثت کا ذکر ہے وہ نبی اور پیغمبر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں آپ کے سوا کوئی اور نبی نہیں ہیں۔

حضرات انبیاء کرام کا سلسلۂ نسب کیونکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں اور پیغمبروں کی فہرست میں ایک نبی بھی ایسے نہیں ہیں کہ جن کے آباء واجداد میں حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام دونوں ہوں۔ (۲) ہاں! غالباً چودہ ہزار یا اس سے کچھ زیادہ نبی اور پیغمبر ایسے ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں مگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک بھی نہیں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیویوں سے دو بیٹے تھے، ایک بیوی حضرت سارہ رضی اللہ عنہا تھیں، حضرت سارہ کا مقام بہت بلند ہے۔

کیا عورت کو نبوت دی گئی؟ اولاد آدم میں تین عورتیں بہت زیادہ مقدس ہیں، اور اتنی مقدس ہیں کہ بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں عورتوں کو نبی اور پیغمبر بنایا ہے۔ اگرچہ ہمارا اور آپ کا، اہلِ سنت والجماعت کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ ہم انہیں نبی نہیں مانتے۔ ان تینوں عورتوں میں سب سے پہلا نام حضرت مریم علیہا السلام کا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہیں، دوسرا نام حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی ہیں۔ اور تیسرا نام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا ہے جن کا نام "یوکابد" ہے۔ تو بعضے لوگوں نے کہا کہ یہ اتنی

(۲) مشکوۃ شریف ص/۵۱۱

اتنی مقدس ہستیاں ہیں کہ انہیں نبوت دی گئی۔ ان لوگوں کی نظر میں نبی اسکو کہتے ہیں کہ جس سے اللہ نے کلام کیا ہو۔ اور اللہ نے حضرت مریم سے بھی کلام کیا ہے۔ اللہ نے حضرت سارہ سے بھی کلام کیا ہے اور اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے بھی کلام کیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي
وَلَا تَحْزَنِي إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيْكِ

اور جب بچہ کی طرف سے خطرہ ہو تو پرواہ نہ کرنا۔ اس کو صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دینا، ہم ملوادیں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام سے بھی بات کی اور حضرت سارہ سے بھی بات کی۔

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ لیکن اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کو نبوت عطا نہیں فرمائی۔ نبوت کے لئے مرد ہونا شرط ہے۔ البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تینوں عورتیں اگرچہ نبیہ نہیں تھیں لیکن نبوت کے بعد کا جو درجہ اور جو مقام ہے وہ انہیں بیشک حاصل تھا۔ نبوت کے بعد کا درجہ کیا ہے؟

فرمایا کہ۔ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم
مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ

کل چار درجے ہیں۔ پہلا درجہ نبوت کا، دوسرا درجہ صدیقیت کا، تیسرا درجہ شہداء کا اور چوتھا درجہ صالحین کا، جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سارہ صدیقیت کے مقام پر فائز ہیں، اگرچہ وہ نبی اور پیغمبر نہیں ہیں۔

اولاد کی تمنا اور اسکا محرک بہرحال! حضرت سارہ تین مقدس خواتین میں سے ایک ہیں، انہیں اولاد نہیں ہوئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اولاد کی تمنا اور خواہش

تھی، دعا مانگی ۔ رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِينَ

اے اللہ! مجھے فرزندِ صالح عطا فرما۔ یہ دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وجہ سے نہیں مانگی جس وجہ سے ہم اور آپ مانگتے ہیں۔ ہماری سوچ یہ ہے کہ اگر کوئی نرینہ اولاد نہ ہوئی تو کل کو جائداد کون سنبھالے گا؟ کاروبار کون سنبھالے گا؟ خاندان کا نام کیسے چلے گا؟ یہ سب گھٹیا باتیں ہیں؛ نبی اور پیغمبر کے ذہن میں یہ باتیں نہیں ہوتیں، نبی اور پیغمبر یہ سوچتے ہیں کہ جو خدمت میرے سپرد کی گئی ہے کل آنکھ بند ہونے کے بعد میرا خلف اور میرا فرزند اسے جاری رکھے۔

حضرت اسماعیلؑ کا نام خود اللہ نے رکھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت سارہ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تو پھر انہوں نے دوسرا نکاح حضرت ہاجرہ جو مصر کی شہزادی تھیں سے کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول کی اور حضرت ہاجرہ سے ان کو فرزند عطا فرمایا۔ بچہ جب حضرت ہاجرہؑ کے پیٹ میں ہی تھا تو اللہ نے فرشتہ کے ذریعہ بشارت دی، فرشتہ نے آکر کہا اللہ تعالیٰ نے اس بچہ کا نام "شَمَاعِ ایل" تجویز فرمایا ہے۔ (۱) جیسے اسرائیل، اسرا کے معنی ہیں عبد، اور ئیل کے معنی ہیں اللہ۔ یعنی عبد اللہ، اللہ کا بندہ۔ اسی طرح شماع کے معنی ہیں منظور کیا ہوا، اور ایل کے معنی ہیں اللہ۔ یعنی اللہ کا منظور کیا ہوا۔ جیسے ہم لوگ بھی نام رکھتے ہیں منظور الٰہی، اللہ دیا، اللہ دتا وغیرہ۔

جسکا مطلب یہ ہے کہ یہ بچہ اسی دعا کی قبولیت کا نتیجہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مانگی تھی کہ اے اللہ! فرزندِ صالح عطا فرما۔ لہٰذا اس بچہ کا نام بھی ایسا ہی رکھا گیا جس میں قبولیتِ دعا کا مفہوم ہے۔

بہرحال! حضرت سارہؑ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی البتہ حضرت ہاجرہؑ سے اللہ

(۱) قصص القرآن جلد اول / ۲۲۵

تعالیٰ نے ایک فرزند عطا فرمایا جنکا نام شماع ایل رکھا گیا، بعد میں چل کر عربوں نے اس کا تلفظ تبدیل کر کے اسکو اسماعیل بنالیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو اللہ کے حکم سے خانہ کعبہ کے قریب لے جاکر آباد کردیا۔ ادھر خدا کی شان دیکھئے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت سارہؓ سے بھی ایک لڑکا عطا فرمایا جنکا نام "اسحٰق" رکھا گیا۔ (۱)

- حضرت اسحٰقؑ اور حضرت اسماعیلؑ دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ دونوں کی مائیں الگ الگ ہیں، حضرت اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں، انہیں کا نام اسرائیل ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اللہ نے بارہ بیٹے دیئے تھے، ان بارہ بیٹوں کی اولاد کو ہی بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل میں ہزاروں نبی تشریف لائے بنی اسرائیل کے اندر تقریباً چودہ ہزار انبیاء تشریف لائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جن کے پاس پوری روئے زمین کی سلطنت تھی، جنکی حکومت ہوا اور پرندوں پر بھی تھی بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے ہیں یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی بنی اسرائیل میں سے ہی ہیں۔

نصاریٰ کی جہالت اگرچہ نصاریٰ اس بات کو نہیں مانتے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ نسب باپ کی طرف سے چلتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو کوئی باپ نہیں ہے لہذا ہم نہیں مانتے کہ یہ اسرائیلی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ نسب کا باپ کی طرف سے چلنا تو اس وقت ٹھیک ہے جبکہ کوئی باپ ہو مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باپ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی پیدائش تنہا ماں کے ذریعہ سے کی ہے اور ماں بنی اسرائیل میں سے

(۱) قصص القرآن جلد اول / ۲۳۸

ہیں لہذا یہ بھی اسرائیلی ہوئے۔

حضور ﷺ ہی دعا کے مصداق ہیں غرضیکہ جتنے انبیاء اور پیغمبر تشریف لائے ہیں ان میں بڑی تعداد ان پیغمبروں کی ہے جو بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس بیٹے کی اولاد میں سے ہیں جنکا نام اسحٰق ہے۔ حضرت اسماعیلؑ جنکو حضرت ابراہیمؑ نے خانۂ کعبہ کے قریب آباد کیا تھا ان کی اولاد میں سے ایک بھی نبی نہیں ہیں، ان کی اولاد میں اول و آخر صرف ایک نبی ہیں جنکا نام ہے "محمد ﷺ "(۱)۔

جسکا مطلب یہ ہے کہ صرف ایک نبی اور پیغمبر ایسے ہیں جو حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے بھی ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے بھی ہیں۔ اور دعا دونوں نے ملکر مانگی ہے۔ فرمایا کہ۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ

اے اللہ ہماری اولاد میں ایک ایسے نبی اور پیغمبر کو مبعوث فرما جو ہم دونوں میں سے ہوں۔ چنانچہ بنو اسماعیل میں صرف ایک نبی آئے ہیں اور وہ محمد عربی ﷺ ہیں جنہوں نے ہمیشہ کیلئے سلسلۂ نبوت کو ختم کردیا۔ وہی آخری نبی ہیں۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ نے فرمایا۔ انا دعوۃ ابراھیم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ڈھائی ہزار سال پہلے جو دعا مانگی تھی اسی دعا کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے مجھ کو مبعوث فرمایا ہے۔

وبشارۃ عیسی اور مجھ سے پانچ سو ساڑھے پانچ سو سال پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جاتے ہوئے ایک بشارت دی تھی، وہ بشارت میرے متعلق ہی تھی۔ فرمایا کہ

وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میرے بعد نبی آخر الزماں آئیں گے

(۱) مسلم شریف حدیث / ۳۲۲۱ ۔ سنن ترمذی حدیث / ۳۵۳۸ ۔ مسند احمد حدیث / ۴، ۱۹۳

جنکا نام "احمد ﷺ" ہو گا" آپ ﷺ نے بنو عامر کے اس شخص سے فرمایا کہ میری نبوت کی بنیاد یہی ہے کہ میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور حضرت عیسیٰؑ کی بشارت کے نتیجہ میں مبعوث کیا گیا ہوں۔

نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں اب دو سوال اور رہ گئے ہیں جو اگرچہ ہمارے موضوع سے متعلق نہیں ہیں لیکن اگر ان کا ذکر ہو جائے تو کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ بنو عامر کے اس آدمی نے کہا، آپ نے بالکل ٹھیک کہا، ایک سوال اور ہے، وہ یہ کہ اگر میں گناہوں اور برائیوں میں مبتلا ہوں تو جب تک میں گناہوں سے توبہ نہ کرلوں اس وقت تک نیکی کرنے کا کوئی فائدہ ہے یا نہیں؟ کیا اس بات کا انتظار کروں کہ پہلے گناہوں سے پاک ہو جاؤں پھر نیکی کروں؟ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، سوائے نبی اور پیغمبر کے جو معصوم ہیں کوئی گناہوں سے خالی نہیں ہے، اگر یہ انتظار کروگے کہ جب گناہوں سے پاک ہو جاؤں گا تب نیکی کروں گا تو قبر میں چلے جاؤ گے لیکن نیکی کی توفیق نہیں ہوگی۔ نیکی کی توفیق تو جب ہوگی جب تم گناہوں کے ساتھ ساتھ نیکی کرنے لگو جیسے جیسے نیکی کروگے گناہ ختم ہوتے چلے جائیں گے۔

دریائے دجلہ اور ایک گندہ آدمی کا مکالمہ مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک گندہ اور غلیظ آدمی بغداد میں دریائے دجلہ کے کنارے چلا جا رہا تھا، دریا کا پانی انتہائی صاف وشفاف تھا، اس نے دریا کو دیکھ کر کہا کہ ایک میں ہوں گندہ اور غلیظ آدمی اور ایک یہ پانی ہے کہ کتنا صاف وشفاف اور پاکیزہ ہے! دریا نے اس سے کہا، اگر تو میری طرح پاک وصاف اور پاکیزہ بننا چاہتا ہے تو آ اور میرے اندر غوطہ لگا۔ اس نے کہا نہیں! میں یہ نہیں کر سکتا، میں گندہ ہوں اور آپ پاک وصاف ہیں، میں اس قابل نہیں ہوں کہ اس قدر صاف شفاف پانی میں غوطہ لگاؤں۔

غلط سوچ محرومی کا باعث تقسیم سے پہلے ایک دفعہ میں پونا (PUNE) گیا تھا، وہاں کے لوگوں نے کہا، صاحب! یہاں تو جلسے عموماً سڑکوں پر ہوا کرتے ہیں، البتہ آپ کیلئے ہمارا خیال یہ ہے کہ شہر کی جامع مسجد میں جلسہ کا انتظام کیا جائے۔ میں نے کہا، جی بہت اچھا! چنانچہ مسجد میں ہی انتظام کیا گیا۔ جب میں وہاں گیا تو دیکھا کہ مسجد میں تو آدمی تھوڑے ہی ہیں البتہ چاروں طرف جو فصیل تھی وہاں بہت سارے آدمی جمع ہیں، میں نے منتظمین سے کہا، بھائی! یہ کیا قصہ ہے؟ کہنے لگے، صاحب! ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ہم گنہگار ہیں، ہم اس قابل نہیں ہیں کہ مسجد میں آسکیں، باقی وعظ سننے کا شوق ہے اس لئے ادھر ادھر کھڑے ہوگئے ہیں، میں نے ان لوگوں سے کہا، اگر آپ مسجد کے اندر آنے کے قابل نہیں ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ باہر رہ کر ہمارے اندر قابلیت پیدا ہوجائے تو یاد رکھے! قیامت تک قابلیت پیدا نہیں ہوسکتی، قابلیت تو مسجد میں داخل ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

بہرحال! اس شخص نے دریائے دجلہ سے کہا، میں اس قابل نہیں ہوں کہ تیرے اندر غوطہ لگا سکوں۔ مولانا جلال الدین رومیؒ نے لکھا ہے کہ دریا نے اس سے کہا، اگر تیرا یہ خیال ہے تو قیامت تک تو پاک نہیں ہوسکے گا، تو آنکھ بند کر کے میرے اندر غوطہ لگا اور جب تو باہر نکلے گا تو تُو پاک وصاف ہوگا اور میرے پانی میں کوئی غلاظت نہیں آئے گی۔

شیطانی مکر و فریب معلوم ہوا کہ نیکیوں سے دور رہ کر اگر تم یہ چاہو کہ پہلے میں گناہوں سے پاک ہوجاؤں پھر نیکی کروں تو کبھی نیکی نہیں کر سکو گے یہ شیطان کا وسوسہ اور گمراہی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا، نیکیاں کرو اگرچہ گناہ بھی ہورہے ہوں، پرواہ نہ کرو۔

إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّـَٔاتِ

تم جتنی نیکیاں کرو گے وہ نیکیاں تمہارے گناہوں کی ظلمت کو دور کرتی چلی

جائیں گی۔ پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ نیکیاں غالب ہو جائیں گی۔

تیسرا سوال بنو عامر کے اس شخص کو یہ بات بہت پسند آئی۔ اس نے کہا، ایک آخری سوال اور ہے، وہ یہ کہ اگر میں آپ کی لائی ہوئی شریعت اور آپ کے لائے ہوئے دین پر عمل کروں تو مجھے کیا ملے گا؟ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ اسکا پھل تم کو "آخرت کی نجات" کے شکل میں ملے گا۔ اس نے کہا، یہ آپ نے ادھار کی بات کر دی، نقد کی کیجئے کہ دنیا میں کیا ملیگا؟

ایک درہم میں دس خیار ایک واقعہ لکھا ہے، ایک اللہ والے درویش تھے، ان کے ذہن میں دنیا کی کوئی بات ہی نہیں آتی تھی، ایک مرتبہ وہ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے، ایک ککڑی بیچنے والے نے آواز لگائی، "ایک درہم میں دس خیار" خیار کے معنی ککڑی کے بھی آتے ہیں اور خیار "خیر" کی جمع بھی ہے جس کے معنی نیکی کے آتے ہیں۔ جیسے ہی یہ آواز ان کے کان میں آئی فوراً ان کے ذہن میں یہ آیا کہ یہ سودا تو بڑا سستا ہے۔ ایک درہم میں دس نیکیاں مل رہی ہیں، پیسہ لیکر دوڑے، باہر جا کر دیکھا تو ٹھیلے پر ککڑیاں رکھی ہوئی تھی لاحول پڑھے اور کہنے لگے میں تو یہ سمجھ کر آیا تھا کہ ایک درہم میں دس نیکیاں مل رہی ہیں! ایسے بھولے بھالے ہوتے ہیں اللہ والے!

تبت سنو! مولانا ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے۔ بیچارے بڑے بھولے بھالے اور سیدھے سادھے تھے۔ ہر وقت ان کا دھیان اللہ کی طرف لگا رہتا تھا، اور کثرت کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے، ایک دفعہ یہاں تشریف لائے، میرے یہاں قیام تھا، میں نے اپنے صاحبزادے سے کہا، حضرت حج کیلئے تشریف لے جارہے ہیں اس لئے کچھ ضروریات ہیں ذرا تم ساتھ بازار چلے جاؤ۔ جب شام کو واپس تشریف لائے تو فرمانے لگے، بھائی! میں نے دیکھا کہ جگہ جگہ سڑکوں پر بورڈ لگے ہوئے ہیں اور اس میں لکھا ہے "تبت سنو" "تبت سنو" کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ "قل ھو اللہ سنو" کیا بات ہے؟ میں

نے کہا۔ حضرت! آپ سے پڑھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ یہ تبت سنو نہیں ہے تبت اسنو (TIBET SNOW) ہے یہ ایک کریم (CREAM) کا نام ہے۔ فرمانے لگے جب ہی تو مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ جگہ جگہ تبت سنو لکھا ہے لیکن قل ھو اللہ سنو کہیں نہیں لکھا ہے۔

بہر حال! حضور اکرم ﷺ کا جواب اس شخص کیلئے کافی تھا کیوں کہ یہ کوئی جالینوس اور افلاطون کی بات نہیں تھی یہ سرکار دوعالم ﷺ کی بات تھی۔ قیامت آسکتی ہے۔ زمین آسمان اپنی جگہ سے ہٹ سکتے ہیں مگر حضور اکرم ﷺ کا قول بدل نہیں سکتا۔ کسی نے بالکل سچ کہا ؎

صدیوں فلاسفی کی چناں اور چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی (کلیات اکبر ج ۳ ص ۹۵)

اسلام پر عمل کرنے کا فائدہ اس نے کہا: مجھے یہ بتائیے کہ اگر میں آپ کی شریعت اور دین پر عمل کرلوں تو مجھے دنیا میں کیا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا، سنو! دو فائدے ملیں گے۔

التمکن فی الارض والنجاۃ فی الاخرۃ

یہ دین اسلام پر عمل کرنے کا نتیجہ ہے۔ نعرہ لگانے کا نتیجہ نہیں ہے۔ آجکل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر دروازے پر اسلام کا بورڈ لگا دیا تو اسلام آگیا۔ اگر سڑکوں پر اسلام کا نعرہ لگا دیا تو اسلام آگیا۔ نہیں! اسلام پر عمل کا فائدہ دنیا و آخرت دونوں میں ملے گا۔ دنیا میں عمل کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اقتدار عطا فرمائے گا۔ حکومت و سلطنت تم کو ملے گی۔ اور آخرت کا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو نجات عطا فرمائیں گے۔ یعنی دنیا میں بھی عزت اور آخرت میں بھی عزت۔ یہ ہے دین!

آمدم بر سر مطلب اس واقعہ کو بیان کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ

کے جواب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے ملکر جو دعا مانگی تھی وہ آپ ﷺ کیلئے ہی مانگی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمایا۔ اور یہ دعا حضور کی بعثت سے ڈھائی ہزار سال پہلے مانگی گئی تھی جبکہ نہ حضرت داؤد علیہ السلام آئے تھے، نہ حضرت سلیمان علیہ السلام آئے تھے، نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے تھے اور نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تھے۔

سرکار دوعالم ﷺ کو خدا نے ساری خصوصیتوں سے نوازا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی پیدائش کیلئے سب سے اعلیٰ خاندان، عمدہ ترین جگہ اور موزوں و مناسب زمانہ کا انتخاب فرمایا، آپؐ کی پیدائش کیلئے روئے زمین کے اس مقام کو منتخب فرمایا جو دنیا کی ساری آبادی کا مرکزی اور محوری حصہ ہے، مرکز عالم ہے۔ اور وہ مکہ ہے۔ اگر آپ دنیا کا نقشہ لیکر بیٹھیں تو معلوم ہوگا کہ روئے زمین کے جس حصہ پر بیت اللہ ہے وہ حصہ پوری دنیا کا مرکزی اور بیچ کا حصہ ہے، اور اس میں حکمت یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کو حضور اکرم ﷺ کے ذریعہ ساری دنیا کے انسانوں تک پیغام پہنچانا تھا اس لئے آپ کی پیدائش کیلئے مرکزی مقام ہی مناسب تھا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے ورود مسعود کیلئے ایسے خاندان کا انتخاب فرمایا کہ روئے زمین پر آدم علیہ السلام کی اولاد میں سب سے افضل، اعلیٰ وارفع خاندان تھا، اور وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا خاندان ہے جو آگے چل کر قریش کہلایا۔

حضور اکرم ﷺ کا ننھیال و ددھیال اور یہ بات غور کرنے کی ہے کہ یہ خاندان دراصل مکہ کا رہنے والا نہیں ہے، حجاز کا رہنے والا نہیں ہے۔ اسی لئے میں عام طور پر سمجھانے کیلئے کہا کرتا ہوں کہ سرکار دوعالم ﷺ کا ددھیال عراق ہے اور ننھیال مصر ہے، یہ میں نے اس وجہ سے کہا کہ آپؐ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام سرزمین عراق میں پیدا ہوئے، وہاں سے ہجرت کر کے ملک شام تشریف لائے اور مصر کی شہزادی

حضرت ہاجرہ سے شادی کی، جن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے بعد میں چل کر انہیں کے خاندان میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے ان کو مکہ میں اللہ کے گھر کے قریب آباد کیا۔ معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کیلئے جگہ کا یہ انتظام تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے کر دیا تھا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام جاکر خانۂ کعبہ کے قریب آباد ہوگئے، وہیں آپ کی نسل چلی، یہی نسل آگے چل کر خاندانِ قریش کہلائی۔ اسی خاندان کے ایک گھرانہ میں جو عبد المطلب کا گھرانہ کہلاتا ہے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ جس خاندان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے وہ خاندان تمام خاندانوں کے مقابلہ میں سب سے اعلیٰ اور افضل خاندان تھا اور جس جگہ پر مبعوث ہوئے وہ جگہ روئے زمین میں سب سے زیادہ افضل ترین جگہ ہے، کیونکہ وہ اللہ کا گھر ہے۔

بیت اللہ کا مطلب اللہ کے گھر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ (نعوذ باللہ) اللہ میاں اس میں رہتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں، بستر بچھا کر سوتے ہیں! اللہ میاں ان تمام عیوب ونقائص سے پاک ہیں۔

بعض کج فہم لوگ بحثیں کرتے ہیں۔ کسی نے کہا صاحب! آپ مجھے مسجد میں بیٹھ کر شراب کیوں نہیں پینے دیتے؟ کہتے ہیں کہ جاؤ شراب خانہ میں جاکر شراب پیو! بازار میں جاکر شراب پیو! تو کیا مسجد میں خدا موجود ہے اور دوسری جگہوں پر خدا موجود نہیں ہے؟ جس طرح مسجد میں خدا موجود ہے، شراب خانہ میں بھی موجود ہے، دوکان میں بھی موجود ہے اور گھر میں بھی موجود ہے، پھر آپ مسجد میں شراب پینے سے کیوں منع کرتے ہیں؟ کہتا ہے ؎ زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر

یا وہ جگہ بتادے جہاں پر خدا نہ ہو

ایسی کوئی جگہ آپ نہیں بتاسکتے! پھر بھی خانہ کعبہ کو آپ اللہ کا گھر کہتے ہیں

جبکہ اللہ ہر جگہ موجود ہے؟

ایک مثال سمجھنے کیلئے اس کی مثال بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ اگر میں آپ سے یہ پوچھوں کہ آپ کے جسم میں روح کس جگہ ہے؟ آپ یہی کہیں گے کہ جی: میں کون سی جگہ بتاؤں؟ وہ تو اوپر سے لیکر نیچے تک سارے جسم میں پھیلی ہوئی ہے۔ انگلی میں بھی ہے۔ ہاتھ میں بھی ہے، پاؤں میں بھی ہے۔ آنکھ میں بھی ہے، ناک میں بھی ہے۔ ہر جگہ ہے، لیکن اس کے باوجود اگر آپ کا ہاتھ کٹ جائے تو آپ زندہ رہتے ہیں، ٹانگ کٹ جائے تو آپ زندہ رہتے ہیں۔ آنکھ نکل جائے تو آپ زندہ رہتے ہیں، ایک گردہ نکال دیا جائے تو آپ زندہ رہتے ہیں۔ پسلیاں تبدیل کردی جائیں تو آپ زندہ رہتے ہیں البتہ ایک چیز ایسی ہے کہ اگر اسے نکال دیا جائے تو آپ کی حیات ختم ہوجائیگی اور وہ قلب ہے!

معلوم ہوا کہ حیات آپ کے پورے جسم میں پھیلی ہوئی ہے مگر اس کا مرکز ایک جگہ ہے جسکو قلب کہتے ہیں۔ اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ کا وجود اور اسکی تجلیات عرش سے لیکر فرش تک کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جہاں نہ ہو۔ وہ ہر جگہ موجود ہے البتہ اسکی تجلیات کا مرکز ایک ہے جسکو بیت اللہ اور خانۂ کعبہ کہتے ہیں اور اس کے واسطے سے روئے زمین کی تمام مساجد اللہ کی تجلیات کے خاص مراکز ہیں۔ دوسری جگہوں کو یہ شرف و فضیلت حاصل نہیں ہے۔

مساجد و بازار میں فرق حدیث میں آتا ہے

"خیر البقاع مساجدھا وشر البقاع اسواقھا" (مشکوۃ شریف ص/۱)

روئے زمین کا بہترین حصہ وہ ہے کہ جس پر مسجدیں بنی ہوئی ہیں اور روئے زمین کا بدترین حصہ وہ ہے کہ جس پر مارکیٹ اور بازار بنے ہوئے ہیں۔ مساجد اور بازار میں اتنا بڑا فرق ہے: حالانکہ مسجد کی تعمیر کیلئے سمنٹ (CEMENT) اسی فیکٹری (FACTORY) سے آیا تھا جس سے دوکان کیلئے آیا ہے۔ مسجد کی تعمیر کیلئے لوہا بھی

وہی استعمال کیا گیا ہے جس سے مارکٹ (MARKET) بنی ہوئی ہے۔ چونا، گچ اور سارا مصالحہ مسجد میں بھی وہی لگا ہوا ہے جو مارکٹ بنانے میں استعمال ہوا ہے پھر بھی دونوں کے درمیان اتنا فرق ہے! کیونکہ فضیلت و شرافت کا تعلق مصالحہ سے نہیں ہے، نقشہ اور بناوٹ سے نہیں ہے، دراصل اس علاقہ اور اس خطہ کو جس میں مسجدیں بنی ہوئی ہیں اللہ کی تجلیات کے ساتھ وہ تعلق ہے جو مارکیٹ اور بازار کو نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی دعوت مرکزی ہے تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ سرکار دو عالم ﷺ کی دعوت چونکہ مرکزی حیثیت کی حامل تھی اس لئے آپؐ کی تشریف آوری کیلئے وہ مقام مناسب تھا جو روئے زمین کا مرکز ہو اور روئے زمین کا مرکز "بیت اللہ" ہے۔ جو اللہ کی خاص تجلیات کا بھی مرکز ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی پیدائش کیلئے مکہ کو منتخب فرمایا۔ اور آپؐ کی پیدائش وہیں ہوئی، اور اس خاندان میں ہوئی جو عزت و شرافت میں معیاری حیثیت رکھتی تھی۔

عورت اسلام کی نظر میں ہماری نظروں میں عفت و عصمت کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ گئی ہے۔ اگر کسی لڑکے یا لڑکی کا ناجائز تعلق قائم ہو جائے تو لوگ کہنے لگتے ہیں کہ ارے صاحب! کیا فرق پڑ گیا؟ اگر ایک مٹکہ میں آپ پانی رکھدیں اور جتنے پیاسے ہیں ان میں سے ہر ایک باری باری آکر پیاس بجھا کر چلا جائے تو اس سے ڈونگے (مٹکہ) کا کیا بگڑ گیا؟ پانی کا کیا نقصان ہو گیا؟ دراصل ان کی نظر میں عورت کی تخلیق کا مقصد ہی ہوس رانی ہے، خواہ وہ دوستی کے ذریعہ ہو، پیسوں کے ذریعہ ہو یا کسی اور ذریعہ سے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے ذہنوں میں عفت و عصمت اور پاکدامنی کا وہ تصور اور وہ احساس نہیں رہا جو اسلام نے ہمارے اندر پیدا کیا تھا۔ اسلام کسی قیمت پر اسے گوارہ نہیں کرتا کہ کسی عورت کی چادر عصمت تار تار ہو جائے، اسلام اس کیلئے جان تک لینے کو تیار ہے۔ چنانچہ اس کیلئے سنگساری اور قتل کی سزا دیتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی خاندانی شرافت خود سرکار دوعالم ﷺ اپنے خاندان کی شرافت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس خاندان اور اس گھرانہ میں پیدا کیا کہ جس خاندان میں حضرت آدم و حوا علیہما السلام سے لیکر نیچے تک میرے جتنے باپ اور جتنی مائیں آئی ہیں ان میں سے کبھی کسی کے درمیان ناجائز تعلقات قائم نہیں ہوئے سب کے سب نیک اور ازدواجی تعلقات کے ساتھ زندگی گذارے ہیں، اور جس طرح حضور اکرم ﷺ کے نسب میں کوئی ماں باپ کے درمیان ناجائز تعلقات کبھی قائم نہیں ہوئے اسی طرح ان میں سے کوئی کبھی غلام اور باندی بھی نہیں رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کو دودھ پلانے والی عورتوں میں سے بھی کوئی عورت کنیز نہیں ہے۔

دودھ کے اثرات کیونکہ بچہ پر دودھ کا بھی اثر ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جب ماں بچہ کو دودھ پلاتی ہے تو اگر ماں نیک ہے تو دودھ کے ساتھ ساتھ بچے کے اندر نیکی بھی جاتی ہے اور اگر وہ نیک نہیں ہے تو دودھ کے ساتھ ساتھ اسکا فساد بھی بچہ میں سرایت کرتا ہے، ہم میں سے اکثر لوگ اس سے ناواقف ہیں۔ معلوم ہوا کہ دودھ کا اثر بچہ پر ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک صحابی کسی جنگ کے موقعہ پر فخریہ فرماتے ہیں۔

انا ابن الاکوع اليوم يوم الرضع (۱)

میں اکوع کا بیٹا ہوں، کسی غلام کا بیٹا نہیں ہوں، اور آج دودھ کے آزمائش کا دن ہے۔ میں نے کسی باندی کا دودھ نہیں پیا ہے جسکا پتہ آج میدان جنگ میں چل جائے گا، اگر میں نے کسی باندی کا دودھ پیا ہے تو ہار جاؤں گا۔ معلوم ہوا کہ باندی کا دودھ کوئی فضیلت پیدا نہیں کرتا۔

ثویبہ خوش نصیب خاتون بہر حال: حضور اکرم ﷺ کے نسب میں کسی ماں باپ کے درمیان کبھی ناجائز تعلقات قائم نہیں ہوئے اور نہ ان میں سے کوئی غلام اور باندی

---

(۱) بخاری شریف ص / ۶۰۳ مسلم شریف حدیث / ۳۳۰۱، سنن ابی داؤد حدیث / ۲۳۰۲، مسند احمد حدیث / ۱۵۹۳۵

تھے اور نہ آپؐ کو دودھ پلانے والی خواتین میں سے کوئی باندی اور کنیز تھیں۔ البتہ ایک خاتون جنکا آپ نے دودھ پیا ہے ایسی تھیں جو آپ کو دودھ پلانے سے پہلے کنیز تھیں۔ ان کا نام ثویبہ ہے۔ یہ عبدالعزی کی کنیز تھیں۔ عبدالعزی حضورؐ کا چچا ہے۔ اسکی کنیت ابولہب ہے۔ یہ وہی ہے جس کے بارے میں قرآن کریم کی سورہ "تبت یدا ابی لھب" نازل ہوئی۔

ثویبہ چونکہ باندی تھیں اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضورؐ کو دودھ پلانے کیلئے یہ انتظام ہوا کہ جب حضور اکرم ﷺ پیدا ہوئے تو سب سے پہلے انہوں نے ہی جاکر اپنے آقا ابولہب کو بشارت دی کہ آپ کے گھرانے میں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے۔ حالات میں لکھا ہے کہ ابولہب بہت خوش ہوا اور انگلی سے اشارہ کرکے یہ کہدیا کہ اس خوشخبری سنانے کے عوض میں نے تجھے آزاد کردیا۔ اب ثویبہ آزاد ہوگئیں پھر انہوں نے حضور ﷺ کو دودھ پلایا۔ ماں کے بعد حضورؐ نے سب سے پہلے جس عورت کا دودھ پیا ہے وہ یہی ثویبہ ہیں جو دودھ پلاتے وقت کنیز نہیں تھیں آزاد تھیں۔

فصاحت و بلاغت کی معراج حضور اکرم ﷺ کو تین عورتوں نے دودھ پلایا ہے۔ سب سے پہلے آپ کی والدہ محترمہ حضرت آمنہؓ نے پھر ثویبہ نے اس کے بعد مستقل طور پر حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا نے دودھ پلایا۔ ایک مرتبہ ایک صحابی نے آپ سے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیر معمولی قوت گویائی اور طلاقت لسانی عطا فرمائی ہے۔ ہمہ وقت آپ کی زبان سے حکمت کے کلمات نکلتے رہتے ہیں۔

کمالاتِ انبیا، وہبی ہوتے ہیں یاد رکھئے! نبیوں کے جو کمالات ہوتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہوتے ہیں وہ کوئی جغرافیائی پیدا وار نہیں ہوتے۔ پاکستان کے اندر جو حکمران ہوتے ہیں ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

ہر کہ آمد عمارت نو ساخت　　　رفت بمنزل دیگرے پرداخت

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر آدمی اپنی جگہ بقراط اور سقراط ہے جبکہ کرسی سے اترنے کے بعد کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کس گلی میں آباد ہو رہے ہیں۔ ایسے ہی حاکموں میں سے کسی نے یہ بات کہی کہ "قومیں گرم علاقوں سے نہیں بنتی ٹھنڈے علاقوں سے بنتی ہیں" مجھے نہیں معلوم کہ یہ بات انہوں نے کس آسمانی صحیفہ سے پڑھ کر کہی لیکن بات یہ ہے کہ آدمی جب کرسی اقتدار پر بیٹھ کر کوئی بات کہتا ہے تو سب لوگ واہ واہ کرتے ہیں جیسا کہ قوالی میں بغیر سمجھے ہوئے بھی لوگوں کو حال آجاتا ہے۔

کمالات کا تعلق جغرافیائی حدود سے نہیں ہوتا یہ تصور غلط ہے! اسلام کی تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ یہ گرم خطوں کے اندر ہی بنی ہے۔ ممکن ہے کسی قوم میں اچھائیاں یا برائیاں آب و ہوا کے اثرات کی وجہ سے آئی ہوں جیسے بعضے لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! میرے اندر تو اعلیٰ قسم کی صلاحیتیں ہیں لیکن بد قسمتی سے میں ایشیا میں پیدا ہو گیا، اگر یورپ میں پیدا ہوا ہوتا تو میرے جوہر کی بڑی قدر ہوتی۔ لیکن نبی اور پیغمبر کی کوئی خوبی اور کوئی اچھائی جغرافیائی اثرات کی پیداوار نہیں ہوتی اللہ کی عطا کردہ ہوتی ہے، انسانوں کی تربیت سے نہیں ہوتی اللہ کی تربیت سے ہوتی ہے، انسانوں کی تعلیم سے نہیں ہوتی اللہ کی تعلیم سے ہوتی ہے۔

سرکار کا جواب سرکار دو عالم ﷺ میں جو قوت گویائی اور طلاقت لسانی تھی وہ بھی خدا کی عطا تھی، مگر آپؐ نے سبق دینے کیلئے جو بات ارشاد فرمائی وہ یہ کہ آپؐ نے فرمایا، تمہیں معلوم نہیں کہ میں نے کس خاتون کا دودھ پیا ہے؟ میں نے خاندان بنو سعد کی ایک نہایت نیک خصلت خاتون کا دودھ پیا ہے جنکا نام حلیمہ سعدیہ ہے۔ فرمایا کہ یہ فصاحت و بلاغت اور قوت گویائی انہیں کے دودھ کے اثرات ہیں۔ معلوم ہوا کہ بچہ کے اوپر ماں کے دودھ کے اثرات ہوتے ہیں۔

لمحۂ فکریہ لہذا جو لوگ عیسائی، مشرکہ اور بے دین عورتوں کو اپنے بچوں کو دودھ

پلانے کیلئے مقرر کرتے ہیں انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے بچوں پر اسی قسم کے اثرات پڑیں گے۔ بلکہ علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جس طرح دودھ کے اندر اثرات ہوتے ہیں اسی طرح خون میں بھی اثرات ہوتے ہیں۔ مجبوری کی صورت میں خون دینے کی اجازت علماء نے دی ہے البتہ بلا ضرورت اجازت نہیں دی ہے۔ مثلاً کوئی آدمی یہ کہے کہ آجکل ذرا کمزوری ہورہی ہے لہذا ایک بوتل خون چڑھوالیں یہ جائز نہیں کیونکہ یہ ضرورت نہیں ہے، ضرورت یہ ہے کہ اطباء کے درمیان یہ طے ہوجائے کہ یہ شخص اتنا کمزور ہے کہ اگر اسے خون نہ چڑھایا گیا تو اسکی جان کو خطرہ ہے۔ اسلام کے اندر ضرورت کا یہی مفہوم ہے۔

شریعت کا مذاق ہم لوگوں نے تو اسے تماشا بنا کر رکھ دیا ہے، ہر چیز کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ قانون ضرورت ہے، حالانکہ قانون ضرورت کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ چند طلباء بس اغواء کرکے لائے جب ان سے پوچھا گیا کہ بھائی! یہ تم نے کیوں کیا؟ کہنے لگے قانون ضرورت کے بناء پر، ہمیں سواری نہیں ملتی تھی اس لئے ہم ضرورتاً بس لے آئے۔ یاد رکھیئے! ہر چیز پر قانون ضرورت نہیں چلتا جب یہ دیکھو کہ مرض بڑھ جانے کا اندیشہ ہے یا جان کا خطرہ ہے تو دوسروں سے خون لیکر چڑھانے کی اجازت ہے اس میں بھی اس بات کی کوشش کرو کہ کسی متقی، پرہیز گار اور دیندار شخص کا خون مل جائے کیونکہ خون میں بھی اثرات ہوتے ہیں۔

لطیفہ کسی صاحب نے مجھے ایک لطیفہ سنایا، پتہ نہیں وہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ ایک مؤذن صاحب تھے ان بے چارے کو خون کی ضرورت پیش آئی تو وہ جو تالیاں بجانے والا طبقہ ہے جسے آپ لوگ ہجڑا کہتے ہیں اس کا خون لیکر ان کو چڑھادیا گیا۔ جب وہ اچھے ہوکر آئے تو اذان دیتے تھے اور ساتھ ساتھ تالیاں بھی بجاتے تھے۔ کسی نے کہا بھائی! یہ کیا کررہے ہو؟ تو لوگ کہنے لگے کہ دراصل ان کے جسم میں ہجڑا کا خون چڑھا دیا گیا

ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہ قصہ صحیح ہے یا غلط ہے لیکن حضور اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق بہرحال بچہ کے پیٹ میں جو دودھ جاتا ہے اس کے ذریعہ نیکی اور بدی کے اثرات بھی اس کے اندر جاتے ہیں۔

دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اللھم

ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ

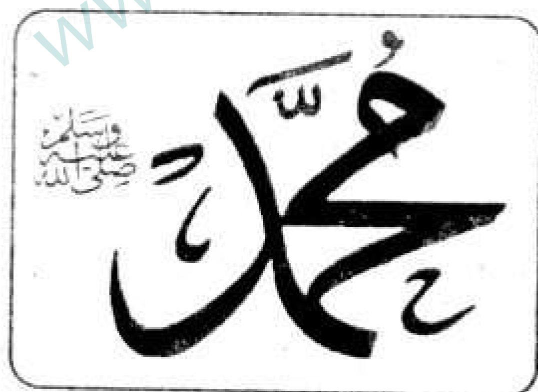
وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد

والہ واصحابہ اجمعین برحمتک

یا ارحم الراحمین

والحمد للّٰہ رب العلمین۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

نعت بعنوان صلّ علیٰ

جب میری چشمِ تصور میں   طیبہ کی فضائیں ہوتی ہیں
پر شوق نگاہیں اٹھتی ہیں   بے تاب دعائیں ہوتی ہیں
دربار نبی میں چھائی ہوئی   رحمت کی گھٹائیں ہوتی ہیں
بخشش کے خزانے لٹتے ہیں   مقبول دعائیں ہوتی ہیں
وہ چاندنی راتوں کا منظر   وہ صحنِ حرم وہ گنبد و در
جب نور قدم کے جلووں سے   معمور فضائیں ہوتی ہیں
گلزار قبا کے دامن میں   کچھ سرو خراماں دیتے تھے
کیا ہوشربا معصوموں کی   معصوم ادائیں ہوتی ہیں
اصلاح جو باطن کی چاہو   طیبہ کو چلو طیبہ کو چلو
کام آئے جو درد دل میں وہاں   ایسی بھی دوائیں ہوتی ہیں
تاثیر محبت کیا کہئے   واللہ مدینے والوں کی
تا عمر جو دل پر نقش رہیں   وہ ان کی وفائیں ہوتی ہیں

جب میری چشمِ تصور میں
طیبہ کی فضائیں ہوتی ہیں

حدودِ عقل

آجکل جن لوگوں کو اجتہاد کا شوق ہے انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ جہاں قرآن کریم کی آیت بصراحت موجود ہے وہاں اجتہاد کا سوال نہیں ہے، جہاں رسول اللہ ﷺ کی سنت موجود ہے وہاں اجتہاد کا سوال نہیں ہے قرآن کریم کی ترجمانی پر اور رسول اللہ کی سنت پر صحابہؓ نے اجماع کرلیا ہے، اور اجماع کا مطلب یہ ہے کہ صحابہؓ نے مل کر یہ طے کرلیا ہے کہ قرآن کی اس آیت کا اور رسول کی اس حدیث کا یہی مفہوم ہے اس کے خلاف کسی شخص کو اجتہاد کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیا کوئی ایسا آدمی ہوسکتا ہے جو یہ کہے کہ میں قرآن کریم کو ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بہتر سمجھتا ہوں؟ میں سنت رسول ﷺ کو صحابہ کرامؓ سے بہتر سمجھتا ہوں؟ حالانکہ صحابہؓ کی آنکھوں نے سرکار دوعالم ﷺ کا جو نور دیکھا ہے قیامت تک اس روئے زمین پر کوئی بڑے سے بڑا ولی اللہ اور بڑے سے بڑا قطب الاقطاب بھی پیدا ہوجائے اسکی آنکھوں کو وہ سعادت حاصل نہیں ہوسکتی۔ صحابہؓ نے اپنی آنکھوں سے حضور ﷺ کو دیکھا ہے اور آپ کو برتا ہے۔

(ارشاد حضرت خطیب الامتؒ)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

حدودِ عقل

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ
وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ
وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّاٰتِ
اَعۡمَالِنَا مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ
وَنَشۡهَدُ اَنۡ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَا شَرِيۡكَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ
اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا
عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ
تَعَالٰى عَلٰى خَيۡرِ
خَلۡقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصۡحٰبِهٖ اَجۡمَعِيۡنَ

اَمَّا بَعْدُ۔ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝
وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝
صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيْمِ وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ
النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

گذشتہ سے پیوستہ بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! سورہ نجم کی ابتدائی آیتیں جو گذشتہ اور گذشتہ سے پیوستہ جمعہ میں تلاوت کی گئی تھی آج بھی انہیں آیتوں کی تلاوت آپ حضرات کے سامنے کی گئی ہے۔ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ستاروں کی قسم کھا کر حضور اکرم ﷺ کی پاکدامنی اور گناہ ومعصیت سے آپ کی پاکی کی شہادت دی ہے۔ فرمایا۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى

نہ آپ کے کردار اور عمل میں کوئی غلطی ہے اور نہ آپ کے عقیدے میں کسی قسم کی کوئی خامی اور کجی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ ہر قسم کی معصیت سے آپ ﷺ کی پاکی کا اعلان فرمایا ہے۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ آپ حق وصداقت پر ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ حق وصداقت کسے کہتے ہیں؟ کیونکہ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ ایک شخص ایک چیز کے بارے میں ایک رائے رکھتا ہے اور دوسرا شخص دوسری رائے رکھتا ہے۔ لہذا حق وصداقت کی کوئی تعریف ہونی چاہیے تاکہ اس کے ذریعہ یہ معلوم ہوسکے کہ یہ صحیح راستہ ہے اور یہ گمراہی کا راستہ ہے۔ اس سلسلے میں میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے عالمِ اجسام یعنی زمین وآسمان کی جو کائنات پیدا کی ہے اس کو عالمِ

موجودات کہتے ہیں۔

عالمِ اصغر و اکبر اب عالمِ موجودات میں ایک طرف انسان ہے اور دوسری طرف کل مخلوقات ہیں، کیونکہ اللہ والے یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بڑا عالم پیدا کیا ہے اور اس کے نمونہ کے طور پر ایک چھوٹا عالم پیدا کیا ہے۔ جیسے ایک املی کا درخت ہوتا ہے جو بہت پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورے محلہ کو گھیر لے گا، اور ایک اسکی بیج ہوتی ہے جو آپ کی ہتھیلی میں آجاتی ہے۔ یہ بھی املی کا درخت ہے، اس میں بھی شاخیں ہیں، اس میں بھی تنہ ہے، اس میں بھی پھول ہے، اس میں بھی سب چیزیں ہیں مگر یہ کہ جو درخت آپ دیکھتے ہیں وہ تفصیل ہے اور یہ جو بیج ہے یہ اسکا اجمال ہے۔ تو اللہ والوں نے بتایا کہ انسان عالمِ اصغر یعنی چھوٹا عالم ہے اور زمین و آسمان اور اس میں جتنی بھی چیزیں ہیں وہ عالمِ اکبر یعنی بڑا عالم ہے۔ کسی عارف نے بالکل صحیح کہا، فرمایا کہ ؎

نگاہ غور جب میں ڈالتا ہوں اپنی ہستی پر
تو خود چھوٹا سا ایک اپنا جہاں معلوم ہوتا ہے

امام غزالیؒ کی تشریح امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، لکھا ہے کہ حضرتِ انسان میں مٹی بھی ہے، پہاڑ بھی ہے، دریا بھی ہے اور جنگل بھی ہے، سب کچھ ہے، یہ بڑی بڑی ہڈیاں جو ہمارے بدن کے اندر ہیں یہ کوہِ ہمالہ ہیں، یہ اس جہاں کے پہاڑ ہیں، ہمارے جسم پر جو بال ہیں وہ سب کے سب جھاڑیاں ہیں، ہمارے رگوں میں جو خون بہتا ہے یہ ندی اور نالے ہیں۔ اسی طرح ہمارے جسم کے اندر جتنے کیڑے اور جراثیم ہیں یہ ہمارے اندر عالمِ حیوانات ہے، تو سارا جہان عالمِ اکبر ہے اور انسان عالمِ اصغر ہے۔

معیارِ حق و صداقت خیر! تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حق و صداقت کسے کہتے ہیں؟

حق وصداقت کا معیار کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے عالمِ موجودات میں حق وصداقت کا فیصلہ کرنے کیلئے انسانوں کو عقل عطا فرمایا ہے۔ یہ اسکی رہبری کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ مفید ہے اور یہ مضر ہے، یہ تریاق ہے اور یہ مہلک ہے، یہ بہتر ہے اور یہ بدتر ہے۔

عقل کا عجز اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایک اور چیز بھی عطا فرمائی ہے جو نظر نہیں آتی جسکا نام روح ہے۔ روح کے بارے میں عقل کوئی ہدایت نہیں دے سکتی۔ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں بڑے بڑے حکماء نے کہا ہے۔ غالباً علامہ اقبال کا شعر ہے۔ فرمایا کہ ؎ جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا

عقل نے اتنی ترقی کی کہ سورج اور چاند کے بارے میں معلومات حاصل کرلی اور ان کی شعاعوں کو بھی بند کرنے کا انتظام کرلیا۔ فرمایا کہ ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا (کلیاتِ اقبال۔ضربِ کلیم)

اگر ان سے کہا جائے کہ یہ روحانیت کی جو زندگی ہے اس کے بارے میں کچھ روشنی ڈالئے، کہنے لگیں گے کہ ہمارے پاس کوئی روشنی نہیں ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا (کلیاتِ اقبال۔ضربِ کلیم)

عقل وہاں عاجز و بیکار ہے

عقل کی تقسیم اسی لئے علماء نے عقل کی تقسیم کی ہے۔ اس کو آپ یوں سمجھئے کہ ایک عقلِ معاش ہے اور ایک عقلِ معاد ہے۔ معاش کے معنی تو آپ حضرات جانتے ہی ہیں۔ کمانا کھانا، یعنی ایک عقل وہ ہے جو انسان کو اپنے کمانے کھانے میں صرف کرنی ہوتی ہے، انتظاماتِ عالم اور امورِ دنیاوی کیلئے خرچ کی جاتی ہے۔ یہ عقلِ معاش ہے۔

ہیں، یہ عقل، عالمِ غیب کی عقل ہے۔ یہی عقلِ معاد ہے۔

انبیاء کی تعلیم انبیائے کرام علیہم السلام اسی عقل کی تعلیم دینے کیلئے دنیا میں تشریف لاتے تھے، عقلِ معاش کی تعلیم دینے کیلئے تشریف نہیں لاتے تھے۔ اسی لئے آپ ﷺ کی زندگی میں بعض ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں جو عقلِ معاش سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے متعلق آپ نے فرمایا، اس کے بارے میں مجھے نہیں معلوم، تم زیادہ جانتے ہو۔

واقعۂ تابیرِ نخل تابیرِ نخل کا واقعہ سیرتِ پاک کا مشہور واقعہ ہے۔ نخل کے معنی ہیں کھجور اور تابیر کے معنی ہیں بیج لگانا۔ آپؐ ایک باغ کے پاس سے گذرے وہاں ایک شخص کھجور کی دو شاخیں لے لے کر جوڑ جوڑ کر لگا رہا تھا۔ آپ ﷺ نے جب دیکھا تو فرمایا کہ بھائی! یہ کیا کر رہے ہو؟ آپ کا مقصد روکنا نہیں تھا مگر اس نے یہ سمجھا کہ شاید حضور مجھے اس سے روک رہے ہیں لہٰذا اس نے ایک ایک شاخ ہی لگائی۔ جب وہ درخت بڑا ہو گیا تو کھجور نہیں آئی۔ اس نے سرکارِ دو عالم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا، یا رسول اللہ! ﷺ آپ نے فرمایا تھا کہ تو یہ کیا کر رہا ہے؟ اس لئے میں نے ایک ایک شاخ کر کے لگائی لیکن پھل نہیں آیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ تم میری بات سمجھے نہیں، میرا مقصد منع کرنا نہیں تھا میں تو صرف تعجب کا اظہار کر رہا تھا، باقی یہ کہ اسکو ملا کر لگانے سے کھجور آتی ہے اور الگ الگ لگانے سے کھجور نہیں آتی یہ مجھے نہیں معلوم؛ فرمایا کہ۔

انتم اعلم بامور دنیاکم

تم اپنے دنیاوی امور کے متعلق مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ یہ نہیں فرمایا کہ کاشتکاری کس طرح ہوتی ہے؟ صابن کس طرح بنتا ہے؟ فلاں چیز کس طرح تیار ہوتی ہے؟ یہ عقلِ معاش ہے، اسکا تعلق تجربہ سے ہے، تم تجربہ کرو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

اور عقلِ معاد کا تعلق روحانیت سے ہے کہ روحانیت میں میل کس طرح آتا

اور عقل معاد کا تعلق روحانیت سے ہے کہ روحانیت میں میل کس طرح آتا ہے؟ روشنی کس طرح آتی ہے؟ روحانیت کو نقصان کس طرح پہنچتا ہے اور روحانیت کو جلا کس سے حاصل ہوتی ہے؟ یہ انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ ارسطو نہیں بتا سکتا، جالینوس اور افلاطون نہیں بتا سکتا۔

دل و دماغ بہرحال: ایک عقلِ معاش ہے اور ایک عقلِ معاد ہے۔ یوں تو سمجھانے کے لئے میں نے دونوں کو لفظ عقل سے تعبیر کیا ہے لیکن دونوں کی جگہ الگ الگ ہے۔ عقلِ معاش کی جگہ دماغ ہے اور عقل معاد کی جگہ دل اور روح ہے، ایک کو مطلقاً عقل کہتے ہیں اور دوسرے کو دل کہتے ہیں۔ عقل وہ ہے جو آپ کو کمانے، کھانے اور دھندے کا راستہ بتاتی ہے کہ آپ کیسا دھندہ کریں؟ کس طرح کمائیں؟ اور دل وہ ہے جو انسان کے جذبات و احساسات کے بارے میں بحث کرتا ہے، اس کیلئے عقل بیکار ہے۔ وہ اسے کچھ نہیں بتا سکتی۔ جیسا کہ ابھی ابھی میں نے آپ کے سامنے علامہ اقبال مرحوم کا شعر پڑھا۔

تو اصل مسئلہ جو ہے وہ پیٹ اور روح کی کشمکش کا ہے۔ عقل اور دل کی کشمکش کا ہے، عقل سے متعلق جتنے علوم ہیں وہ سب آپ کو کمانے کھانے کا طریقہ بتاتے ہیں اور دل سے متعلق جو علوم ہیں وہ آپ کو آخرت کا راستہ دکھاتے ہیں۔

علم و فن اسی لئے معاف کیجئے گا ہم اس علم کو علم نہیں کہتے جو آپ کو صرف کمانے اور تجارت کرنے کا راستہ بتاتا ہے۔ اسکا نام علم نہیں ہے، اسکا نام فن ہے۔ علم وہ ہے جو اللہ کی معرفت پیدا کرے اور آخرت کا راستہ دکھائے۔ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں علامہ جلال الدین رومیؒ فرما رہے ہیں۔ فرمایا کہ ؎

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت   زنگ گمراہی زدل بزدایدت

علم وہ ہے جو دل کے زنگ کو دور کرے اور آخرت کا راستہ دکھائے۔ باقی آپ

علم نہیں ہے اسکا نام فن ہے۔ فن پیٹ کی غذا مہیا کرتا ہے اور علم دل کی غذا مہیا کرتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم کا ایک اور شعر یاد آگیا۔ فرمایا کہ ؎

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا (کلیات اقبال ارمغانِ حجاز)

لڑائی روح اور پیٹ کی ہے۔ یعنی دنیا ہر چیز کو کھانے پینے اور پیٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہتی ہے جبکہ علم نبی آپ کو یہ بتاتا ہے کہ صرف پیٹ ہی پیٹ نہیں ہے۔ عالمِ آخرت بھی ہے اسکی بھی فکر کرو، اعمال و اخلاق کو بھی دیکھو اور روحانیت کی ترقی بھی طے کرو۔

اکبر الہ آبادی کی شخصیت علامہ اقبال کے علاوہ ایک اور حکیم، فلسفی اور صوفی شاعر یاد آگئے، وہ اکبر الہ آبادی مرحوم ہیں۔ جو جج تھے، انگریزی تعلیم یافتہ تھے لیکن وہ اللہ والے تھے، عارف باللہ تھے، ان کی زندگی کے بعض واقعات ایسے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۃً اللہ تعالیٰ نے ان کے سینہ میں معرفت بھرا دل رکھا تھا۔ ان کے بیٹے کا نام "عشرت" تھا۔ جب وہ پڑھنے کیلئے ولایت جانے لگا تو یہ اس کے خلاف تھے کہ بچہ پڑھنے کیلئے ولایت جائے۔ کہتے تھے کہ اس سے بیٹے کے عقائد خراب ہوجائیں گے، اس کے اعمال خراب ہوجائیں گے۔ اور انہیں سرسید سے اسی وجہ سے اختلاف بھی تھا۔ بہرحال! بیٹا بات نہیں مانا اور ولایت چلا گیا، پھر وہی ہوا جسکا خوف تھا، وہاں کی ہوا لگی، اکبر الہ آبادی اس کو بار بار بلاتے رہے مگر وہ واپس نہیں آیا۔

اکبر الہ آبادی کی اپنے فرزند کو نصیحت جب وہ ولایت جارہا تھا تو اس نے اکبر الہ آبادی سے کہا، ابا جی! مجھے ایک ایسی گیند کی خواہش ہے جس کے اوپر گھوڑے کی تصویر بنی ہوئی ہو۔ باپ کے دل میں بیٹے کی تمنا اور خواہش پوری کرنے کا جذبہ ہونا لازمی امر ہے انہوں نے بہت ڈھونڈا اور تلاش کیا مگر ویسی گیند کہیں نہیں ملی۔ جب بیٹا

ولایت چلا گیا تو اکبر الہ آبادی کو ایک جگہ ایسی گیند نظر آ گئی جس پر گھوڑے کی تصویر تھی، انہوں نے اسکو خرید کر حفاظت سے بکس میں رکھ دیا۔

بیٹا جب ولایت گیا تو وہ واپس نہیں آیا۔ جب وہ وہاں سے فارغ ہو چکا تو ایک میم صاحبہ سے شادی بھی کرلی اور ایک بڑا سرکاری ملازم یعنی ڈپٹی کلکٹر (DEPUTY COLLECTOR) ہو گیا تو آیا۔ میم صاحبہ ساتھ ہیں۔ ان کے اعزاز میں بڑی شاندار دعوت ہوئی بڑے بڑے حکام شریک ہوئے اس وقت اکبر الہ آبادی جاکر اپنے بکس سے وہ گیند نکال کر لائے اور کہا۔ بیٹا! جب تم ولایت جارہے تھے اس وقت تم نے کہا تھا کہ مجھے ایک ایسی گیند چاہئے جس پر گھوڑے کی تصویر ہو۔ لو یہ وہی گیند ہے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اکبر گیند دے رہے ہیں لیکن صاحبزادے اس گیند کو ہاتھ بھی نہیں لگا رہے ہیں۔

جو لوگ اس واقعہ کو دیکھ رہے تھے ان سے اکبر الہ آبادی نے کہا کہ شاید آپ لوگ مجھے خبطی سمجھ رہے ہوں گے کہ ایک صاحب اولاد بیٹا کو جو ڈپٹی کلکٹر ہے گیند پیش کر رہے ہیں۔ فرمایا کہ بیٹا! میں پاگل ودیوانہ نہیں ہوں۔ آج میں تمہیں یہ سبق دینا چاہتا ہوں کہ آج سے آٹھ دس سال پہلے جب تم بچے تھے تو تمہیں ایسی گیند کا شوق تھا کہ جس کے اوپر گھوڑے کی تصویر ہو لیکن آج اسی گیند کو لیتے ہوئے تمہیں شرم آرہی ہے؟ اس سے تمہیں یہ سبق حاصل کرنا چاہئے کہ جب کل کا شوق آج تمہیں شرمندہ کررہا ہے تو پھر آج کوئی ایسا شوق نہ لگالینا جو تمہیں کل عالمِ آخرت میں شرمندہ کردے۔

اندازہ لگایا۔ آپ نے؟ کتنے بڑے عارف باللہ تھے! اسی لئے میں نے ان کی تعریف کی۔

قومی بقاء کیلئے مسلمانانِ ہند کی جد جہد ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں نے اپنی قومی بقا کیلئے چند پروگرام بنایا۔ اس کے تحت درسگاہیں بنیں۔ چند اللہ والوں نے ملکر دارلعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ کچھ لوگوں نے مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ قائم کیا۔ جب ان دونوں کے درمیان کشمکش ہونے لگی تو ایک درمیانی ادارہ قائم ہوا جسکا نام ندوۃ العلماء لکھنو ہے۔ اکبر الہ آبادی ان تینوں اداروں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ابھی میں آپ کو بتا رہا تھا کہ روح و بدن کا معرکہ بہت بڑا معرکہ ہے جو آج بھی جاری ہے۔ آج بدن روح پر غالب آچکا ہے۔

ہے دل روشن مثال دیوبند اکبر الہ آبادی سے کسی نے پوچھا کہ صاحب! یہ تینوں درسگاہیں جو قائم ہوئی ہیں ان کا نصب العین کیا ہے؟ انہوں نے اسکا جواب دیا۔ انہیں کے الفاظ میں سن لیجئے۔ فرمایا کہ ؎

ہے دل روشن مثال دیوبند　　　اور ندوہ ہے زبان ہوشمند
ہاں علی گڑھ کی بھی تم تشبیہ لو　　　ایک معزز پیٹ بس اسکو کہو

ایک روحانیت کا مرکز ہے۔ ایک شکم اور پیٹ بھرنے کا مرکز ہے۔ آپ اسے یوں کہئے کہ ایک علم کا مرکز ہے۔ ایک فن کا مرکز ہے۔ یعنی ایک میں یہ بتایا جائے گا کہ نوکری اس طرح کرو، روپیہ اس طریقہ کماؤ اور اس طریقہ سے دولت جمع کرو وغیرہ۔ اور ایک میں یہ بتایا جائے گا کہ کس طریقہ سے سرکار دوعالم ﷺ کے دین کو زندہ کیا جائے۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ دو چیزیں ہیں۔ "عقل اور دین" عقل کا کام ہے کاروبار سکھانا اور دین کا کام ہے سرکار دوعالم ﷺ کی سنت کو سکھانا۔ یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں علامہ اقبال مرحوم فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ ؎

الا یا خیمگی خیمہ فرو ہل
کہ پیش آہنگ بیروں شد ز منزل　　　(حیات اقبال)

اے گنبد خضراء میں آرام کرنے والے! اے خیمہ کے اندر آرام کرنیوالے! باہر نکل کر اپنی امت کو دیکھ! وہ جو رہبر ہمیں لیکر جا رہا تھا وہی اپنے منزل سے ہٹ گیا ہے۔ اب ہم کیا کریں؟

خرد از راندن محمل فرو ماند

زمام خویش دادم در کف دل (حیات اقبال)

میں نے تجربہ کر کے دیکھ لیا کہ عقل ہمارے قافلہ کو لیکر نہیں چل سکتی اس لئے میں نے اپنا باگ ڈور دل کے حوالہ کر دیا۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ عقل کاروبار سکھانے کا ذریعہ ہے اور دل معرفت خداوندی کی جگہ ہے۔ عقل عالم موجودات کے متعلق فیصلہ کرتی ہے، عالم غیب اور روحانیت کے سلسلہ میں خاموش ہے کچھ نہیں کہتی۔

مجتہدی مجتہد خیر! یہ تو گذشتہ جمعہ کا مضمون تھا، اس وقت بات میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حق وصداقت کی نشاندہی کون کرے؟ آجکل تو ہر کس و ناکس اس کیلئے اپنے آپ کو اہل سمجھتا ہے، آج ہر شخص مجتہد ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ معاف کیجئے! آج اجتہاد وہ کر رہا ہے جو قرآن کریم کی ایک آیت بھی صحیح تلاوت نہیں کر سکتا، جو کلمہ بھی صحیح تلفظ کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا۔ آج ایسے ہی لوگوں کو آپ حضرات مجتہد بنا رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے بالکل سچ فرمایا ؎

ز اجتہاد عالمان کم نظر

اقتداء بر رفتگان محفوظ تر

بھائی! اجتہاد تو ہم بھی چاہتے ہیں لیکن یہ نہیں کہ کوئی معمولی سا طالب علم یہ کہے کہ میں ابو حنیفہؒ کے اجتہاد سا اجتہاد کرنا چاہتا ہوں، ایسے لوگوں کے اجتہاد سے ہم باز آئے۔ یہ کم نظر عالم ہیں، اس سے بہتر ہے کہ ہم پرانے لوگوں کے کہنے پر عمل کر لیں۔ یہ اقبال کا کہا ہوا ہے، میرا کہا ہوا نہیں ہے۔

اجتہاد کے اصول آجکل جن لوگوں کو اجتہاد کا شوق ہے انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ جہاں قرآن کریم کی آیت بصراحت موجود ہے وہاں اجتہاد کا سوال نہیں ہے، جہاں رسول اللہ ﷺ کی سنت موجود ہے وہاں اجتہاد کا سوال نہیں ہے، جہاں

قرآن کریم کی ترجمانی پر اور رسول اللہ ﷺ کی سنت پر صحابہؓ نے اجماع کرلیا ہے۔ اور اجماع کا مطلب یہ ہے کہ صحابہؓ نے مل کر یہ طے کرلیا ہے کہ قرآن کی اس آیت کا اور رسول کی اس حدیث کا یہی مفہوم ہے اس کے خلاف کسی شخص کو اجتہاد کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیا کوئی ایسا آدمی ہوسکتا ہے جو یہ کہے کہ میں قرآن کریم کو ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے بہتر سمجھتا ہوں؟ میں سنت رسول ﷺ کو صحابہ کرامؓ سے بہتر سمجھتا ہوں؟ حالانکہ صحابہؓ کی آنکھوں نے سرکار دوعالم ﷺ کا جو نور دیکھا ہے قیامت تک اس روئے زمین پر کوئی بڑے سے بڑا ولی اللہ اور بڑے سے بڑا قطب الاقطاب بھی پیدا ہوجائے اسکی آنکھوں کو وہ سعادت حاصل نہیں ہوسکتی۔ صحابہؓ نے اپنی آنکھوں سے حضور صلی اللہ کو دیکھا ہے اور آپ کو برتا ہے۔

اخروی معاملات میں عقل عاجز ہے تو خیر! میں عرض یہ کر رہا تھا کہ دو چیزیں ہیں ایک دنیا ، ایک دین و آخرت۔ دنیاوی معاملات میں بیشک آپ عقل کو رہبر اور رہنما بنایئے دنیاوی معاملات میں بیشک آپ عقل کو ہادی بنایئے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا ہی اسی کام کیلئے کیا ہے لیکن اخروی معاملات میں عقل عاجز و مجبور ہے۔ یہاں ہمارا ہادی وحی ہے ہدایت کا راستہ خالصتہً وہی راستہ ہے جو وحی بتلاتی ہے۔

وحی کسے کہتے ہیں؟ وحی کیا ہے؟ یہی ہمارا آج کا مضمون ہے۔ عربی میں وحی کے معنی آتے ہیں "مخفی طور پر اشارہ کرنا" ایک اشارہ تو وہ ہوتا ہے جس کو ہم اور آپ دیکھ لیں جیسے میں نے اشارہ کیا آپ نے دیکھ لیا پھر سمجھ لیا۔ لیکن وحی ایسا اشارہ ہوتا ہے جو مخفی ہو یعنی اسکی کوئی علامت ونشانی نہیں ہوتی کہ کس طریقہ کا اشارہ ہوا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے؟ ناراضگی کس چیز میں ہے؟ حق کیا ہے؟ باطل کیا ہے؟ انسان کی عقل اسکا پتہ نہیں چلا سکتی۔ معاف کیجئے گا۔ ہم اور آپ نماز میں ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں لیکن ایمانداری سے بتایئے کہ کیا کسی کو

اپنے اس ساتھی کے بارے میں جو برابر میں کھڑا ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ کیا نہیں چاہتا ہے؟ تو جب انسان، انسان کی خواہش کا پتہ نہیں چلا سکتا، اس کی مرضیات و نامرضیات کا پتہ نہیں چلا سکتا تو ایک انسان خدا کی مرضیات و نامرضیات کا پتہ کیسے چلا سکتا ہے؟ حق و باطل کا پتہ کیسے چلا سکتا ہے؟

وحی نبوت کی علامت ہے ظاہر ہے کہ اس کا پتہ صرف وحی سے ہی چل سکتا ہے اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے عظیم شخصیتوں کو جنہیں ہم اور آپ انبیاء کرام علیہم السلام کہتے ہیں منتخب فرمایا۔ ان پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی۔ یہی نبی کی نشانی اور علامت ہے۔ نبی وحی سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ۔

قُلْ إِنَّمَآ أَنَا۠ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰٓ إِلَيَّ

میں بے شک بشر ہوں لیکن میرے اوپر وحی نازل کی جاتی ہے۔ یہی نبوت کی علامت ہے۔

نبوت کی عمر انبیاء کرام کو یہ ملکہ کب دیا جاتا ہے؟ اس وقت دیا جاتا ہے جب وہ حواسِ خمسہ کی منزل سے اونچے ہوجاتے ہیں قوت تمیز کی منزل سے اونچے ہوجاتے ہیں اور عقل کی منزل سے اونچے ہوجاتے ہیں۔

میں نے گذشتہ جمعہ عرض کیا تھا کہ بچہ جب کچھ بڑا ہوجاتا ہے اور اس کے حواس کام کرنے لگتے ہیں تو سات سال سے لیکر بارہ تیرہ سال کے درمیان ایک قوت ملتی ہے اس کو "قوت تمیز" کہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد وہ عقل کی منزل پر پہنچتا ہے۔ جب اسے عقل آتی ہے تو جو کچھ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، کانوں سے سنتا ہے اور ناک سے سونگھتا ہے ان سب کو ملاکر دلیلیں قائم کرتا ہے، عقل کے ذریعہ مقدمات قائم کرتا ہے اور نتیجہ نکالتا ہے... تو جب حواس مکمل ہوجاتے ہیں تو قوت تمیز ملتی ہے اور جب قوت تمیز مکمل ہوجاتی ہے تو قوتِ عقل ملتی ہے۔ اور جب کسی کی عقل رفتہ رفتہ

اپنے سارے کمالات مکمل کر کے اپنی انتہائی منزل کو پہنچ جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو منتخب کر کے اس کے عقل کے اوپر نبوت کی اینٹ رکھتے ہیں۔

مقام نبوت معلوم ہوا کہ نبوت کا مقام عقل کے کمالات سے اوپر ہے، جہاں عقل کے کمالات ختم ہوجاتے ہیں وہاں سے نبوت کا دور شروع ہوتا ہے۔ لہذا نبی اور پیغمبر کے کسی بات پر آپ کا یہ کہنا کہ مجھے عقل سمجھاؤ بعید از قیاس ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسا کہ ہم اوپر کی منزل سے آپ کو سمجھائیں اور آپ کہیں کہ نیچے کی منزل سے سمجھاؤ۔ ہم یقین کی منزل سے سمجھائیں اور آپ کہیں کہ شک کی منزل سے سمجھاؤ۔

مثال سے سمجھئے مثلاً اگر اس مسجد ایسا زمین دوز تہہ خانہ ہو کہ وہاں سے آسمان نظر نہ آئے، اور ایک آدمی اس میں طلوع و غروب کا نقشہ اور گھڑی لیکر بیٹھ گیا، پہلے اس نے نقشہ دیکھا اور یہ کہا کہ آج اکتوبر کی گیارہ تاریخ کو چھ بجکر بارہ منٹ پر آفتاب غروب ہوگا پھر گھڑی دیکھی اور نیچے سے ہی اعلان کر دیا کہ آفتاب غروب ہوگیا۔ اور ایک آدمی منار کے اوپر بیٹھا ہوا ہے، وہ اپنی آنکھوں سے آفتاب کو دیکھ رہا ہے، اس نے اعلان سن کر کہا ارے ظالم! تونے غلط فیصلہ کیا ہے، ابھی تو مجھے سورج نظر آرہا ہے۔ تم نے کیوں یہ اعلان کر دیا؟ وہ یہی کہے گا کہ میرا نقشہ کہہ رہا ہے کہ آج چھ بجکر بارہ منٹ پر غروب ہے اور میری گھڑی کہہ رہی کہ چھ بجکر بارہ منٹ ہوگئے اس لئے میں نے اعلان کر دیا۔ لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ ہوسکتا ہے کہ نقشہ مرتب کرنے والے نے نقشہ غلط مرتب کر دیا ہو یا ہوسکتا ہے کہ نقشہ اسکا صحیح ہو اور گھڑی غلط ہو۔ بہر حال وہ شک کی منزل سے اعلان کر رہا ہے اور یہ منار پر بیٹھ کر یقین کی منزل سے اسکو رد کر رہا ہے۔

قول نبی عقل کی محتاج نہیں تو میرے دوستو! نبی اور پیغمبر کی بات کے متعلق اگر آپ یہ کہیں کہ مجھے عقل سے سمجھاؤ تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ ہم منار سے اتر کے تہہ خانہ میں جاکر آپ کو سمجھائیں جبکہ ہم وہاں سے یقین کے ساتھ آنکھوں دیکھی ہوئی بات

بتارہے ہیں۔ اور یہ جو دیکھنے اور سننے کا فرق میں نے بیان کیا یہ بھی علامہ اقبال کا کہا ہوا ہے۔ فرمایا کہ ؎

خرد کے پاس خبر کے سوا، کچھ اور نہیں

(نقشہ خبر دیتا ہے، گھڑی خبر دیتی ہے)

خرد کے پاس خبر کے سوا، کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا، کچھ اور نہیں

تیرا علاج یہ ہے کہ نبی اور پیغمبر عالم غیب کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں وہ آنکھوں سے دیکھ کر کہتے ہیں اس لئے اس پر بلا چون وچرا یقین کرلے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحقیق حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوبات میں لکھا ہے کہ جو شخص قول نبی کو یا وحی کو سن کر یہ کہے کہ میں اسے اس وقت تک نہیں مانوں گا جب تک کہ یہ میری عقل میں نہ آجائے تو لکھا ہے کہ ایسا شخص کافر ہے۔ اور اسکی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ شخص دراصل اللہ کی وحی اور نبی کی نبوت پر ایمان نہیں لایا ہے بلکہ اپنی عقل پر ایمان لایا ہے۔

لہٰذا آپ حضرات یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ جب انسان کے حواس غلطی کرتے ہیں تو قوت تمیز اسکی رہبری کرتی ہے اور جب قوت تمیز غلطی کرتی ہے تو عقل اسکی رہبری کرتی ہے اور جب عقل سے غلطی کا صدور ہوتا ہے تو اللہ کی وحی اسکی رہبری کرتی ہے۔ تو وحی عقل کی رہبر ہے۔ عقل وحی کی رہبر نہیں ہے۔ لہٰذا آج جو لوگ شریعت اسلامیہ کو اپنی عقل کے تابع کرنا چاہتے ہیں دراصل وہ لوگ اللہ کی وحی کو غلام بنا کر عقل کو اس کا امام بنانا چاہتے ہیں۔

خیر! تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انبیاء کرام کی طرف وحی اس وقت آتی ہے جب ان کے عقل کی تمام منزلیں مکمل ہوجاتی ہیں۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

نبوت کے منصب پر سرفراز فرماتے ہیں ان کے حواس مکمل ہوتے ہیں، ان کی قوت تمیز مکمل ہوتی ہے اور ان کی عقل مکمل ہوتی ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑا عاقل اور حکیم کی مثال بھی اگر آپ سامنے لائیں تو سرکار دوعالم ﷺ کی عقل کے مقابلے میں وہ طفل مکتب ہیں۔

نبی کی فطری صلاحیت دراصل جس بچہ کو اللہ تعالیٰ آگے چل کر نبی بنانا چاہتے ہیں اس کو شروع ہی سے آنکھوں سے دیکھنے کی، کانوں سے سننے کی اور ہاتھوں سے چھونے کی جو قوت دیتے ہیں وہ عام بچوں سے علیحدہ قوت ہوتی ہے، ایک عام بچہ جب پیدا ہوتا ہے اسکو اللہ تعالیٰ جو صلاحیتیں عطا فرماتے ہیں اسکو تولہ بھر سے شروع کرتے ہیں جبکہ جو بچہ آگے چل کر نبی ہونے والا ہوتا ہے اسکو اللہ تعالیٰ پہلے دن سے سیر بھر سے شروع کرتے ہیں۔ اگر یہ فرق نہیں ہوتا تو سرکار دوعالم ﷺ جب حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کا دودھ پی رہے تھے تو آپ کو یہ شعور کس نے عطا فرمایا تھا کہ جو عورت مجھے دودھ پلا رہی ہے اسکی گود میں ایک بچہ اور بھی ہے اس لئے آپ ﷺ صرف ایک طرف کا ہی دودھ پیتے تھے دوسری طرف کا نہیں پیتے تھے کہ کہیں میرا بھائی بھوکا نہ رہ جائے۔ اس طفولیت کے زمانہ میں اتنا شعور کہ اگر ہم اور آپ چالیس سال سے بھی متجاوز ہوجائیں تو اتنا شعور ہمارے اندر نہیں آتا ہے، نبی کے جذبات اور احساسات اتنے کامل ہوتے ہیں کہ دنیا میں کسی کے جذبات واحساسات اتنے کامل نہیں ہوتے، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کے اندر جسمانی اور روحانی اعتبار سے بال برابر بھی کمی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسکو نبوت کا مستحق نہیں قرار دیتے۔ تو نبی کی قوت تمیز کامل ہوتی ہے، عقل کامل ہوتی ہے یہاں تک کہ جسمانی بناوٹ اور جسمانی طاقت کے اعتبار سے بھی نبی سب سے کامل اور مکمل ہوتے ہیں۔

حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ جو ابھی صحابی نہیں ہوئے

تھے نے ایک مرتبہ حضورؐ سے کہا، یا رسول اللہ ﷺ ! میں تو پڑھا لکھا نہیں ہوں، میں کیا جانوں کہ قرآن میں کیا ہے؟ معجزہ کیا ہے؟ میں تو پہلوان آدمی ہوں، کشتی لڑنا جانتا ہوں، اگر آپ مجھے کشتی میں پچھاڑ دیں تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا، سرکار دو عالم ﷺ نے منظور فرمالیا، کشتی ہوئی اور آپ نے حضرت رکانہ کو پچھاڑ دیا۔ حدیث میں آتا ہے جب رکانہ پچھڑ گئے تو اپنی پیٹھ اور اپنے جسم کو حضور کے جسم سے ملنے کی کوشش کر رہے تھے کہ شاید پھر ایسا موقعہ نہ ملے۔ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ ایمان لے آئے۔

اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو نبوت عطا فرماتے ہیں وہ تمام کمالات میں سب لوگوں سے زیادہ ہوتے ہیں حتی کہ جسمانی طاقت میں بھی سب سے زیادہ ہوتے ہیں، ان کا کوئی مقابل نہیں ہوتا۔

بہرحال! آپ ﷺ کی عقل بنی نوع انسان میں سب سے زیادہ کامل و مکمل تھی، پھر بھی آج دنیا میں ایسے ایسے عقلمند ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے قول کو عقل کی کسوٹی پر پرکھیں گے۔ ارے ظالمو! عقل کی گمراہی کو دور کرنے کیلئے ہی تو اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی ہے کہ اس ذریعہ تم عقل گمراہی کو درست کرلو!

عقل کی حقیقت

اب رہی یہ بات کہ عقل کیا چیز ہے؟ عقل کسے کہتے ہیں؟ تو آجکل کی اصطلاح میں اسے یوں سمجھئے کہ جیسے آپ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں، فلاں کی چمچہ گیری کرتا ہے، تو آجکل اگر چمچہ گیری کا امام دیکھنا ہو تو وہ امام عقل ہے، عقل چمچہ گیری میں سب سے آگے ہے۔ اگر کوئی آدمی چوری ڈکیتی کرنا چاہتا ہے تو عقل کہے گی کہ آیئے آیئے میں آپ کو اسکا راستہ بتاتی ہوں، میں آپ کو ترکیب اور طریقہ بتاتی ہوں، کس چیز کا؟ قتل و چوری کا! اسی طرح اگر ایک آدمی تہجد پڑھنا چاہتا ہے یا کوئی اور نیکی کرنا چاہتا ہے تو عقل اس کو نیکی کا راستہ بھی بتاتی ہے۔ تو چور کی عقل چور ہوتی ہے، صوفی اور عارف کی عقل عارف ہوتی ہے۔ علامہ اقبال نے غلط نہیں کہا، فرمایا کہ ؎

عقل عیار ہے سو بھیس بنالیتی ہے
عشق بیچارہ نہ ملّا ہے نہ زاہد نہ حکیم (بال جبریل)

یہ تو بہروپیہ ہے، کبھی پوسٹ مین (POST MAN) کا لباس پہن کر آتا ہے، کبھی فلم ایکٹر (FILM ACTOR) کا لباس پہن کر آتا ہے اور کبھی اللہ والوں کا لباس پہن کر آتا ہے۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ یہ قابل ہدایت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو منجانب اللہ یہ اشارہ کیا جاتا ہے کہ کونسی چیز جائز ہے، اور کونسی چیز ناجائز ہے۔ اللہ کیا چاہتے ہیں اور کیا نہیں چاہتے ہیں۔ اور یہ اشارہ بذریعہ وحی ہوتا ہے۔ اور وحی کس طریقہ پر آتی ہے؟

اللہ والوں کی تحقیق بھی قابل قدر ہے آپ حضرات ان لوگوں کو تو داد دینے سے نہیں تھکتے، جنہوں نے دنیا میں کسی نئی چیز کا پتہ چلایا ہے، کہتے ہیں کہ فلاں نے ایک نیا بڑا اعظم کا پتہ چلایا ہے جسکا نام امریکہ ہے۔ کولمبو (COLOMBO) نے فلاں چیز کا پتہ چلایا، فلاں نے فلاں چیز کا پتہ چلایا لیکن کبھی اللہ کے ان عارف بندوں کو بھی داد دے دیا کرو جنہوں نے اس بات کا پتہ چلایا کہ دل کی بناوٹ کیسی ہے! میں اس سے پہلے بھی آپ حضرات کو بتاچکا ہوں کہ یہاں دل سے مراد گوشت کا لوتھڑا نہیں ہے بلکہ دل سے مراد جذبات و احساسات کا مرکز ہے جو مہبط وحی ہے، جو اللہ کے رہنے کی جگہ ہے۔ اسکو اللہ کے عارف بندوں نے بتایا ہے اور سبحان اللہ! کیا خوب کہا ہے۔

عالم محسوسات میں دل کی مثال فرمایا کہ عالم محسوسات میں دل کی مثال ایسی ہے کہ جیسے گاجر ہے۔ یعنی دل کی شکل گاجر جیسی ہے، اور اس کے چاروں طرف شیشہ کی کھڑکیاں ہیں، جسکا مطلب یہ ہے کہ اس میں چاروں طرف سے ہوا آتی ہے، آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف سے ہوا آتی ہے۔ لیکن یہ کیسے پہچانا جائے کہ کس طرف سے ہوا آرہی ہے؟ فرمایا کہ اگر کسی طرف باغ ہے تو ہوا ٹھنڈی آئے گی، اگر کسی طرف پاخانہ

ڈالنے کی جگہ ہے، تو ہوا بدبودار آئے گی، اگر سمندر ہے تو ہوا بھیگی آئے گی اور اگر کسی طرف پہاڑ ہے تو خشک آئے گی۔ فرماتے ہیں کہ حضرت انسان کے دل میں جو طرح طرح کے خیالات اور وسوسے آتے ہیں وہ انہیں دروازوں سے آتے ہیں جن سے مختلف قسم کی ہوائیں آتی ہیں، خیالات آتے ہیں۔ کبھی یہ خیال آتا ہے کہ میں جنید بغدادیؒ بن جاؤں اور کبھی یہ خیال آتا ہے کہ میں ابلیس کا بھی چچا بن جاؤں۔ فرمایا کہ گھبراؤ نہیں! یہ خیالات اس وجہ سے آتے ہیں کہ کبھی باغ کی طرف سے ہوا آتی ہے تو کبھی جہاں پاخانہ ڈالا جاتا ہے اس طرف سے ہوا آتی ہے۔ خیالات آتے ہیں۔ اس کی پرواہ نہ کرو۔ عارف نے کہا ؎

گاہ شک برد فرشتہ بر پاکی ما
گاہ خندہ زند دیوز ناپاکی ما

کبھی کبھی تو ہم ایسے مقدس ہوجاتے ہیں کہ اگر ہمارے دل کی حالت فرشتوں کو معلوم ہوجائے تو وہ بھی عش عش کرنے لگیں اور کبھی ابلیس بھی شرما جائے کہ یہ تو میرا بھی چچا بن گیا۔

گاہ شک برد فرشتہ بر پاکی ما | گاہ خندہ زند دیوز ناپاکی ما
ایماں تو سلامت بلب گور بریم | احسنت بریں چستی و چالاکی ما

بھائی! ہواؤں کا کوئی اعتبار نہیں ہے، آنے دو، ادھر سے آئی تو کیا ہے ادھر سے آئی تو کیا ہے۔ سوال عمل کا ہے، عمل کے ذریعہ ایمان کو محفوظ کرکے قبر تک لیجاؤ۔ خیالات کو چھوڑ دو۔

نبی کے دل کی مثال انہیں اللہ والوں نے یہ بھی بتایا کہ نبی اور پیغمبر کے قلب کی مثال ایسی ہے جیسے "پائپ"۔ پائپ میں دو منہ ہوتے ہیں ایک، ایک سرا پر دوسرا دوسرے سرا پر، اگر پائپ میں ایک طرف سے کوئی چیز ڈالی جائے تو وہ براہ راست

دوسری طرف سے نکل جاتی ہے۔ فرمایا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے قلوب کا ایک کنارہ خلق خدا کی طرف ہوتا ہے اور دوسرا کنارہ اللہ کی طرف ہوتا ہے۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں اللہ تعالیٰ جو چیز ڈالتے ہیں اسے آپ براہ راست خلق خدا تک پہنچا دیتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ مرضی اس چیز میں ہے اور اللہ کی ناراضگی اس چیز میں ہے۔ اللہ اس کو حق کہتا ہے اور اسکو باطل کہتا ہے۔

اب آپ حضرات اندازہ لگایئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر حق پر کون گا؟ جن کی زندگی اپنی سوچ پر مبنی نہیں ہے۔ جن کی زندگی اپنی عقل پر مبنی نہیں ہے۔ جن کی زندگی اپنے شعور پر مبنی نہیں ہے۔ جن کی زندگی اللہ کی وحی پر مبنی ہے۔ جنکی کی زندگی کی بنیاد اللہ کا کلام ہے۔

خاتمہ میرے دوستو! اگر ہم اور آپ بھی گمراہی سے بچنا چاہتے ہیں تو اسکا ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ ہم سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑیں۔ کیونکہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حق پر ہیں تو جو دامن پکڑے گا وہ بھی اپنی زندگی حق پر گذارے گا۔

دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه

وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه ربنا لاتزغ قلوبنا

بعد اذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة انك انت الوهاب ربنا

تقبل منا انك انت السميع العليم سبحان ربك رب العزه

عما يصفون وسلام على المرسلين

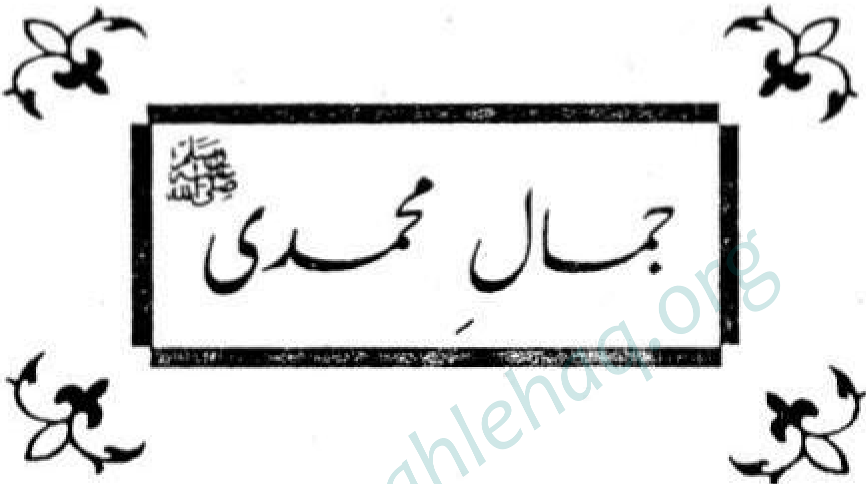
والحمد لله رب العلمين

برحمتك ياارحم الراحمين

جمالِ محمدیؐ

حضور اکرم ﷺ کا حسن کامل درجہ کا حسن تھا، ایسا حسن اللہ نے کسی کو نہیں دیا۔ غزوہ احد میں جب حضور اکرم ﷺ کافروں کے نرغے میں آگئے اور آپؐ کا دندانِ مبارک شہید ہوگیا۔ اور خود یا زرہ کا ایک حلقہ آپؐ کے رخسارِ مبارک میں چُبھ گیا، آپؐ کے چہرہ انور سے خون بہہ رہا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا منھ لگایا اور دانت کے ذریعہ اس حلقہ کو کھینچ لیا جس کی وجہ سے حلقہ کے زخم کا نشان بن گیا تھا، مگر صحابہ کہتے ہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ کے چہرہ اقدس پر زخم کا یہ نشان بن گیا تو اس نشان کی وجہ سے آپؐ کا حسن اتنا دو بالا ہوگیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ آپؐ کے حسن میں اسی کی کمی تھی جو اس نشان نے پوری کردی۔ ممکن ہے آپ کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے اور آپ یہ سمجھیں کہ یہ داغ اور دھبہ ہے اس سے حسن میں کیونکر اضافہ ہوسکتا ہے مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ حسن اس کا نام نہیں ہے جس کی تعریف نے کی ہے بلکہ حسن دراصل اس کو کہتے ہیں جس کو سرکار دوعالم ﷺ کے چہرہ پر جگہ مل جائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم



اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحٰبِهٖ اَجْمَعِيْنَ

اَمَّابَعْدُ. فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (۱۲۸) سُوْرَةُ التَّوْبَة

صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِیْمِ وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِیُّ الْكَرِیْمُ وَنَحْنُ عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِیْنَ وَالشَّاكِرِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

آنحضرت ﷺ کی شرافت نسبی بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! گذشتہ جمعہ میں یہ عرض کررہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو آدم کی اس نسل اور اس قبیلہ میں پیدا فرمایا جو باعتبار نسب کے سب سے زیادہ شریف قبیلہ تھا۔ اور شرافت نسبی یہ ہے کہ نسب میں کہیں اور کسی جگہ بھی کوئی بدنما داغ اور دھبہ موجود نہ ہو۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے خود بھی اس کا اظہار فرمایا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر میرے والد عبداللہ تک اور حضرت حواء علیہا السلام سے لیکر میری والدہ آمنہ تک درمیان میں جتنے باپ اور جتنی مائیں ہیں ان سب کا آپس تعلق دین ومذہب کے مطابق صحیح طریقہ پر قائم ہوا ہے، نکاح کے ساتھ قائم ہوا ہے۔ درمیان میں ایسا کوئی تعلق موجود نہیں ہے جو بدنامی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ یہ نسبی شرافت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو خاندان قریش میں مبعوث فرمایا۔ اور نسب کے متعلق تھوڑی سی تفصیل میں نے گذشتہ جمعہ کو عرض کی تھی۔

پیغمبر علیہ السلام کا حسن وجمال پھر نسب کے علاوہ بہت سے کمالات اور بہت سی خوبیاں ایسی ہیں جو آپؐ کے جسم وبدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ آپ کی صلاحیتوں سے

تعلق رکھتی ہیں، آپ کے علم و عمل سے تعلق رکھتی ہیں۔ جہاں تک آپ ﷺ کے جسم و بدن کے کمالات کا تعلق ہے روئے زمین پر اللہ تعالیٰ نے ایسی حسین صورت کسی کو عطا نہیں فرمائی جو حضور اکرم ﷺ کو عطا فرمائی ہے۔ حالانکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن مشہور ہے، اور اس لئے مشہور ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو حسن اللہ تعالیٰ نے بطور اعجاز کے عطا فرمایا تھا اور اعجاز کا مطلب یہ ہے کہ یہ خاص طور پر صرف انہیں کو دیا گیا کسی اور کو نہیں دیا گیا۔ جیسے حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار پچاس سال کی عمر عطا فرمائی تھی، یہ ان کا معجزہ تھا ورنہ انسانوں کی ساخت اور بناوٹ ایسی ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایک سو ڈیڑھ سو سال سے زیادہ اس ڈھانچہ میں چلنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ تو حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ایک معجزہ ہے، اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن بھی معجزہ ہے مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو جو حسن عطا فرمایا تھا وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن سے بھی زیادہ ہے۔ فرمایا کہ ۔

حسن یوسفؑ دم عیسیٰؑ ید بیضاء داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

جتنے نبی اور پیغمبر تشریف لائے ہیں، کسی میں ایک کمال ہے، کسی میں دوسرا کمال ہے، کسی میں تیسرا کمال ہے، لیکن حضور اکرم ﷺ میں اللہ نے تمام کمالات جمع فرمادیئے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں علماء نے تفصیل سے لکھا ہے اور حسن یوسف علیہ السلام ہی کیا علماء نے کوئی چیز ایسی نہیں چھوڑی ہے کہ جس کے بارے میں پوری تحقیق نہ کی ہو۔

حسن کی حقیقت حسن کے متعلق علماء نے لکھا ہے کہ حسن ایک ایسی چیز ہے کہ جس کی حقیقی تعریف کوئی نہیں کرسکتا ہے۔ بس! جس کو جو چیز پسند آجائے اس کیلئے وہ

حسین ہے۔ اور پسندیدگی کیلئے ہر ایک کا مذاق الگ الگ ہے۔ آپ اگر گندمی رنگ یا کھلا اور صاف رنگ پسند کرتے ہیں تو یہ آپ کا اپنا مذاق ہے لیکن بعضے ملک ایسے ہیں کہ وہاں کے لوگ اس رنگ کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کالوں میں سے ہیں۔ اسے پسند نہیں کرتے۔ اور بعضے ملک ایسے ہیں کہ وہاں کے لوگ اسی رنگ کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو گوروں میں سے ہیں۔ ہمیں تو کالا رنگ پسند ہے۔

افریقہ کے اندر حسن کا معیار یہ ہے کہ رنگ اتنا کالا ہو کہ سیاہی میں چمک پیدا ہو جائے۔ لیکن آپ کے معیار میں یہ حسن نہیں ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سی چیزیں ہیں کہ جن میں حسن کا معیار الگ الگ ہے۔ کسی کو بڑی بڑی آنکھیں پسند ہیں کسی کو چھوٹی چھوٹی آنکھیں پسند ہیں۔ کسی کو سیاہ بال پسند ہے تو کسی کو سنہرا بال پسند ہے۔ کسی کو کوئی قد وقامت پسند ہے تو کسی کو کوئی قد وقامت پسند ہے۔ جیسے بعض شعراء اپنے محبوب کے قد کی تعریف میں تشبیہ دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ میرے محبوب کا قد اتنا سڈول اور حسین ہے جیسے سرو کا درخت ہے لیکن ایک شاعر کہتا ہے کہ جن لوگوں نے محبوب کے قد کو سرو کے درخت کے ساتھ تشبیہ دی ہے انہوں نے صحیح نہیں کیا ہے۔ کہتا ہے کہ۔

وائے بر شاعرانِ نادیدہ　　غلطی رابخود پسندیدہ
سرو را قدِ یار می گویند　　سرو چوبیست ناتراشیدہ

جان بوجھ کر شاعروں نے غلطی کی ہے۔ ارے ظالم! تو نے تو یہ دیکھ لیا کہ سرو لمبا اور سیدھا چلا گیا ہے لیکن یہ نہیں دیکھا کہ جو چکناہٹ محبوب کے قد میں ہے وہ سرو کے درخت میں نہیں ہے۔

حسن کے انتخاب میں اختلاف مذاق جسکا مطلب یہ ہے کہ پسندیدگی اور ناپسندیدگی کیلئے مختلف قسم کے مذاق ہیں لہذا حسن کی حقیقی تعریف نہیں ہو سکتی۔ بعض

لوگوں نے حسن کی تعریف یہ کی ہے کہ جو نظروں کو بھا جائے وہ حسین ہے۔ اگر آپ کہیں گے کہ یہ رنگ کالا ہے تو جواب دیا جائے گا کہ جس کی نظر میں یہ بھا گیا ہے اس سے پوچھو! اس کی نظر سے دیکھو!

لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید

لیلیٰ کے حسن کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھنا چاہیے۔ تمہاری آنکھوں کو بھائے یا نہ بھائے اس کو پسند ہے۔ اور میری رائے میں حسن کی یہ تعریف سب سے بہتر تعریف ہے لیکن بعض علماء نے اسکی یہ تعریف کی ہے کہ انسان کے جسم میں جتنے اعضاء ہیں ان سب کے درمیان ایک نہایت لطیف قسم کی موزونیت ہو۔ ان سب میں برابری ہو۔

مثال کے طور پر ایک حسین مخلوق جس کی اونچائی ساڑھے پانچ فٹ ہو تو اس اونچائی کی مناسبت سے دیکھئے کہ اس کا سر کتنا بڑا ہونا چاہیے؟ اس کے ہاتھ کتنے بڑے ہونے چاہئیں؟ اس کی ٹانگیں کتنی بڑی ہونی چاہئیں؟ اس کے پاؤں کتنے بڑے ہونے چاہئیں؟ اس کی آنکھیں کتنی بڑی ہونی چاہئیں؟ اگر اس قدوقامت کے اوپر جسم کے تمام اعضاء میں موزونیت موجود ہے تب تو وہ حسین ہے اور اگر اس میں موزونیت نہیں ہے۔ بے ڈھنگا پن ہے تو اسے حسین نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً ساڑھے پانچ فٹ کے قد کے اوپر ہمارا یہ سر بھلا لگتا ہے لیکن اگر اس کے حجم کو تھوڑا سا بڑھا دیا جائے اور اتنا بڑا کر دیا جائے جیسے کہ پانی رکھنے کا گھڑا ہوتا ہے تو بھدا معلوم ہوگا اسی طرح سے اگر سر کو اتنا چھوٹا کر دیا جائے جیسے کہ بجلی کا قمقمہ ہوتا ہے تب بھی بھدا معلوم ہوگا۔ اس لئے کہ سر اور قدوقامت کے درمیان جو تناسب ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہے۔

گجرات کے شاہ دولہ کی کہانی آپ نے گجرات میں انہیں دیکھا ہوگا جو شاہ دولہ کے چوہے کہلاتے ہیں۔ یہ وہی شاہ دولہ ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے " جدھر مرتضیٰ مولیٰ ادھر شاہ دولہ "۔ گجرات کے قریب ہی وزیر آباد میں ایک دریا ہے۔ ایک مرتبہ

اس دریا میں بڑا زبردست سیلاب آیا، پانی شہر میں داخل ہونے لگا۔ لوگ شاہ دولہ کے پاس گئے۔ انہوں نے پہلے تو انکار کیا کہ میں کچھ نہیں کرسکتا ہوں لیکن جب لوگوں نے اصرار کیا کہ نہیں! آپ اللہ کے مقرب بندہ ہیں، آپ دعا کریں یہ مصیبت ٹل جائے گی۔ فرمایا کہ اچھا، ایک پھاوڑا لاؤ! لوگ پھاوڑا لے آئے۔ فرمایا چلو! اور جاکر جہاں سیلاب آیا ہوا تھا اس کے قریب کی زمین کھودنے لگے۔ لوگوں نے کہا، حضور! یہ آپ کیا کررہے ہیں؟ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اگر ہم کو ایک دن ڈوبنے میں لگے گا اگر آپ نے زمین کھود دیا تو بس دو گھنٹے میں ہی ڈوب جائیں گے۔ تو انہوں نے جواب میں فرمایا "جدھر مرضیٰ مولیٰ ادھر شاہ دولہ" اگر خدا کی مرضی یہی ہے کہ وہ ہم کو پانی میں غرق کردے تو تم کیا یہ سمجھتے ہو کہ شاہ دولہ اس کے خلاف چاہے گا؟ نہیں! "جدھر مرضیٰ مولیٰ ادھر شاہ دولہ" اور جیسے ہی انہوں نے کھودنا شروع کیا پانی اترنا شروع ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ کبھی تدبیر کچھ ہوتی ہے اور نتیجہ کچھ ہوتا ہے۔ فرمایا کہ ؎

الٹی ہی چال چلتے ہیں دیوانگانِ عشق
آنکھوں کو بند کرتے ہیں دیدار کیلئے

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت

حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے محدث تھے، حدیث کے ہمارے بھی استاذ تھے، بڑے اللہ والے تھے، راندیر میں ان کا مزار ہے، ان کے والد بھی خدا کے بڑے مقبول، درویش اور فقیر تھے، ایک وقت ایسا آیا کہ بارش بند ہوگئی۔ لوگ ان کے پاس گئے اور جاکر کہا کہ حضرت! آپ دعا کریں کہ کسی طرح بارش ہوجائے۔ فرمایا کہ اللہ مجھ سے ناراض ہے، میں جو کرتا ہوں اللہ اس کے خلاف کرتا ہے، میں جو چاہتا ہوں اللہ اس کے خلاف چاہتا ہے، اس لئے مجھ سے دعا نہ کراؤ! لوگوں نے کہا، نہیں حضرت! آپ تو خدا کے بڑے مقبول اور مقرب بندہ ہیں۔ فرمایا کہ میں جو کہہ رہا ہوں اسے مان جاؤ! لوگوں نے کہا،

نہیں مانتے۔ فرمایا کہ اچھا ایک چادر لاؤ؛ چادر لائی گئی، انہوں نے اسے دھوکر سوکھنے کیلئے دھوپ میں ڈال دیا۔ بس؛ جیسے ہی دھوپ میں ڈالا فوراً ابر آگیا اور بارش ہونے لگی۔ فرمایا کہ دیکھو؛ میں نے کہا تھا نا کہ میں جو چاہتا ہوں اللہ اس کے خلاف چاہتا ہے، اللہ میاں نے ہماری چادر سوکھنے نہیں دی۔

حسن نام ہے اعضاء کے تناسب کا

تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ شاہ دولہ کے چوہے مشہور ہیں، ان کے چھوٹے چھوٹے سر ہوتے تھے، جس کی وجہ سے ان میں حسن نہیں تھا، ہاتھ ٹھیک، پاؤں ٹھیک، تمام اعضاء ٹھیک لیکن سر چھوٹا تھا جس کی وجہ سے حسن کے معیار سے نکل گیا۔

اور اگر فرض کرلیجئے کہ سر موزوں اور مناسب حجم کا ہی ہو لیکن ہاتھ ایک ایک بالشت کا ہو، انگلیاں چھوٹی چھوٹی ہوں یا ٹانگیں بالکل چھوٹی ہوں جیسے کہ شترمرغ کی ہوتی ہیں تو آپ اندازہ لگائیے کہ کتنا بھدا لگے گا۔ علماء نے لکھا ہے کہ حسن کی تعریف یہ ہے کہ اللہ نے جو قدوقامت دیا ہے اسی مناسبت سے سر بھی ہو، اسی مناسبت سے چہرہ بھی ہو، اسی مناسبت سے آنکھیں بھی ہوں، اسی مناسبت سے ناک اور کان بھی ہو، اسی مناسبت سے ہاتھ اور پاؤں بھی ہوں۔ جب یہ تناسبِ اعضاء کسی کے اندر پیدا ہوجائے تو اسی کو حسین کہتے ہیں اور فرمایا کہ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے انسان سے بڑھ کر کسی مخلوق کو حسین نہیں بنایا۔ اور یہ بات اللہ تعالی نے قسم کھا کر بیان فرمائی ہے۔

فرمایا کہ۔ وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ ﴿١﴾ وَطُورِ سِينِينَ ﴿٢﴾ وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ﴿٣﴾
لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ﴿٤﴾

(ترجمہ:۔ قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور طور سینین کی اور اس امن والے شہر کی ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچہ میں ڈھالا ہے) (معارف القرآن)

احسن کے معنی عربی میں آتے ہیں "سب سے زیادہ حسین" یعنی انسان سے

زیادہ حسین مخلوق نہیں پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا حسین ڈھانچہ اور ایسا حسین قالب عطا فرمایا ہے کہ اس پوری کائنات میں کسی مخلوق کو نہیں عطا فرمایا۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی فقاہت ایک عورت حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گئی اور جا کر یہ کہا کہ آج میرا شوہر کسی بات پر مجھ سے ناراض ہو گیا اور مجھے طلاق دے دیں۔ اس نے یہ الفاظ کہے۔ "اگر تو چاند سے زیادہ حسین نہیں ہے تو تجھکو تین طلاق" اب میں یہ پوچھنے آئی ہوں کہ میں کیا کروں؟ مجھ پر تو طلاق واقع ہو گئی کیونکہ میں چاند سے زیادہ حسین تو کیا لالٹین سے زیادہ حسین بھی نہیں ہوں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جا! تو اپنے شوہر کے گھر پر رہ، تیرے اوپر طلاق واقع نہیں ہوئی اس لئے کہ خدا نے قسم کھا کر کہا ہے کہ ہم نے سب سے زیادہ حسین مخلوق انسان کو بنایا ہے۔ خدا کی قسم! تو چاند سے زیادہ حسین ہے۔ اور فرمایا کہ تو نے یہ دیکھ لیا کہ چاند میں روشنی اور چمک ہے لیکن کیا چاند میں یہ بادام جیسی آنکھیں ہیں؟ کیا اس کے پاس یہ لمبی لمبی زلفیں ہیں؟ کیا اس کے یہ چمکتے ہوئے دانت ہیں؟ کیا اس کا یہ قدوقامت ہے؟ اس زمانہ میں یہ حضرات لوگوں کی مشکلات کو حل کیا کرتے تھے۔

امام ابو حنیفہؒ کی ذہانت ایک عورت غالباً حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ حضرت! جب میں اپنے شوہر سے کہتی ہوں کہ آٹا ختم ہو گیا، دال ختم ہو گئی تو وہ ناراض ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی اتنا ناراض ہو جاتا ہے کہ مجھے خطرہ ہونے لگتا ہے کہ یہ طلاق دے بیٹھے گا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب چیزیں انتہائی سستی تھیں، خود میں نے اپنے زمانہ میں دیکھا ہے کہ ایک روپے کے بیس پچیس سیر گیہوں آتے تھے اور ایک روپے کا دو سیر خالص گھی آتا تھا۔ تو جب اس زمانہ میں عورتوں کی فرمائش پر مردوں کو غصہ آتا تھا تو آجکل پتہ نہیں کیا ہوتا ہو گا۔ اس لئے کہ آجکل کی گرانی تو ایسی ہے جیسے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قہر آ رہا ہے۔

بہر حال! اس عورت نے حضرت امام ابو حنیفہؒ سے کہا کہ حضرت! میری مشکل حل کیجیے! امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، تم ایسا کرو کہ جب کبھی تمہارا آٹا ختم ہو جایا کرے تو تم اپنے شوہر سے نہ کہنا! بلکہ تم یہ کرنا کہ خالی بوری لے جاکر صحن میں ڈال دینا۔ چنانچہ اس عورت نے یہی کیا، جب آٹا ختم ہو گیا تو بوری لے جاکر صحن میں ڈال دی، شوہر نے جب دیکھا کہ آٹے کی خالی بوری صحن پڑی ہوئی ہے تو وہ ہنسنے لگا اور کہنے لگا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تو امام ابو حنیفہؒ کے پاس گئی ہے اور انہوں نے ہی یہ تدبیر بتائی ہے۔

حسن کے اقسام خیر! حسن کے بارے میں ذکر ہو رہا تھا کہ حسن دراصل نام ہے تناسبِ اعضاء کا، پھر حسن کی بہت سی قسمیں ہیں۔ میں ان میں سے دو قسموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اور یہ دونوں حسن وہ حسن ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو عطا فرمایا تھا۔ ایک حسن وہ ہے کہ جب اس پر پہلی نظر پڑے تو انسان ہوش و حواس کھو بیٹھے، اس حسن کے جو اثرات ہوتے ہیں وہ دیکھنے والے کے اپنے اختیار سے نہیں ہوتے، اپنے قابو سے نہیں ہوتے، اسی طرح یہ اثرات کسی کی آواز سننے سے بھی ہو جاتے ہیں۔ فرمایا کہ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

اسی لئے خواتین کو بلا ضرورت کسی سے بات کرنے سے منع فرمایا ہے اور اگر ضرورت پڑ جائے تو ترش لہجہ میں کریں، آواز بنا بنا کر نہ کریں۔

تو ایک حسن وہ ہے کہ جب دیکھنے والے کی پہلی نظر اس پر پڑے تو ہوش و حواس غائب ہو جائے لیکن پھر اگر اسی آدمی نے اس حسن کو دوسری مرتبہ دیکھا تو اب وہ کیفیت نہیں رہی، پھر تیسری مرتبہ دیکھا اب برداشت ہو گیا، جتنا جتنا دیکھتا چلا جا رہا

ہے قوت برداشت بڑھتی چلی جارہی ہے۔ یہ حسن بہت اعلیٰ درجہ کا حسن ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن اور یہی حسن اللہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا۔ دنیا کا کوئی فرد بشر ایسا نہیں تھا خواہ وہ مرد ہو یا عورت جو پہلی مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر مدہوش نہ ہوگیا ہو۔ بلکہ یہ بات تجربہ میں بھی آچکی تھی۔ جب زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت میں گرفتار ہوگئی تو بعض عورتوں نے اسے ملامت کی اور برا بھلا کہا۔ انہوں نے کہا کہ ہاں ہاں حسین ہوں گے لیکن ایسا بھی کیا کہ تو نے ہوش و حواس بھی کھو دیا؟ حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن کا تجربہ زلیخا کو ہوچکا تھا۔ اس نے کہا کہ ہم تم کو بھی تجربہ کرادیتے ہیں۔ چنانچہ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک کمرہ میں بٹھا دیا اور تمام ملامت کرنے والی عورتوں کو بلا کر ایک کمرہ میں بٹھا دیا اور ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری اور ایک لیموں دے دیا اور کہا کہ تم لیموں کاٹو۔ وہ لیموں کاٹ رہی تھیں کہ زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کو لیکر ان کے سامنے آگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عورتیں مدہوش ہوگئیں اور لیموں کاٹتے کاٹتے اپنی انگلیاں کاٹ لیں اور انہیں پتہ بھی نہیں چلا۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن تھا۔

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن مگر علماء نے لکھا ہے کہ ایک حسن اس سے بھی اعلیٰ ہے وہ دوسری قسم کا حسن ہے۔ اور وہ حسن یہ ہے کہ جب پہلی دفعہ اس پر نظر ڈالی جائے تو کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔ دوسری مرتبہ میں حسن کچھ زیادہ نظر آتا ہے پھر جب تیسری مرتبہ نظر ڈالی جاتی ہے تو بے چینی اور بے قراری آجاتی ہے اور جب چوتھی مرتبہ دیکھا جاتا ہے تو کیفیت پہلے سے زیادہ خراب ہوجاتی ہے۔ یعنی جتنی مرتبہ نگاہ ڈالتے چلے جاؤ اثر بڑھتا چلا جائے گا۔ فرمایا کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے یہی حسن عطا فرمایا تھا۔ پہلی نظر میں دیکھنے والا اگرچہ مدہوش نہیں ہوتا تھا مگر جب بار بار دیکھتا تھا تو ہیبت زدہ ہوجاتا تھا۔ آپ کے حسن کے علیحدہ علیحدہ کمالات نظر آتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک صحابی کہتے ہیں کہ چودھویں رات کا چاند نکلا ہوا تھا اور حضور اکرم ﷺ سرخ حلہ پہنے ہوئے چاند کی روشنی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں کبھی حضورؐ کے چہرہ کی چمک کو دیکھتا تھا اور کبھی چاند کی چمک کو دیکھتا تھا خدا کی قسم! میں نے حضور اکرم ﷺ کو چاند سے زیادہ خوبصورت اور حسین پایا۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو اللہ نے جو حسن عطا فرمایا تھا وہ دنیا میں کسی کو عطا نہیں فرمایا۔ اور وہ حسن ایسا تھا کہ دیکھنے والے کے اندر رفتہ رفتہ اثر کرتا تھا۔ فرمایا کہ ؂

يزيدك وجهه حُسنا إذاما زدته نظرا

جتنی جتنی نظر ڈالتے چلے جاؤ گے حسن بڑھتا ہوا نظر آئے گا۔

حضرت یوسفؑ اور سرکار دوعالم ﷺ کے حسن میں فرق

اسی لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا عورتوں کو تجربہ کرانے کیلئے ان کے ہاتھ میں لیموں نہیں دیتیں۔ انہیں معلوم ہے کہ پہلی مرتبہ حضورؐ کو دیکھ کر مدہوشی کی کیفیت پیدا نہیں ہوگی۔ انہوں نے کیا کہا؟ فرمایا کہ ؂

لواحی زليخا لورأين جَبينه

لآثرن بقطع القلوب على اليد

خدا کی قسم! زلیخا کو ملامت کرنے والی عورتیں جنہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن کو دیکھ کر لیموں کے بدلے میں انگلیاں کاٹ لی تھیں آج اگر وہ حضور اکرم ﷺ کے حسن کو دیکھتیں تو بجائے انگلیاں کاٹنے کے کلیجے کاٹ لیتیں۔

لواحی زليخا لورأين جبينه

لآثرن بقطع القلوب على اليد

تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ حضور اکرم ﷺ کا حسن کامل درجہ کا حسن تھا۔ ایسا حسن اللہ نے کسی کو نہیں دیا۔ غزوہ احد میں جب حضور اکرم ﷺ کا فروں کے

نرغے میں آگئے اور آپؐ کا دندانِ مبارک شہید ہوگیا۔ اور خَود یا ذرہ کا ایک حلقہ آپؐ کے رخسارِ مبارک میں چبھ گیا، آپؐ کے چہرہ انور سے خون بہہ رہا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا منھ لگایا اور دانت کے ذریعہ اس حلقہ کو کھینچ لیا جس کی وجہ سے حلقہ کے زخم کا نشان بن گیا تھا، مگر صحابہ کہتے ہیں کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس پر زخم کا یہ نشان بن گیا تو اس نشان کی وجہ سے آپؐ کا حسن اتنا دو بالا ہوگیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ آپؐ کے حسن میں اسی کی کمی تھی جو اس نشان نے پوری کردی۔ ممکن ہے آپ کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے اور آپ یہ سمجھیں کہ یہ داغ اور دھبہ ہے اس سے حسن میں کیونکر اضافہ ہوسکتا ہے مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ حسن اس کا نام نہیں ہے جس کی تعریف نے کی ہے بلکہ حسن دراصل اس کو کہتے ہیں جس کو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر جگہ مل جائے۔ فرمایا کہ ؎

حسن خود حسن ہوا تیرے حسین ہونے سے
روئے زیبا تیرا خود زینت زیبائی ہے

ہم تو حسن اسے کہتے ہیں جسکو حضورؐ کے چہرہ پر جگہ مل جائے اگر وہ داغ دھبہ ہو تو حضورؐ کے چہرہ پر وہ بھی حسین معلوم ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جامع کمالات تھے تو میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی اور جسمانی کمالات بیان کئے، جسمانی کمالات میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحت وتندرستی بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو وہ صحت وتندرستی اور قوتِ بدنی عطا فرمائی تھی جو اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر کسی کو عطا نہیں فرمائی۔ آج جس آدمی کو تندرست کہا جاتا ہے اس کے اندر بیماری تو ہوتی ہے لیکن وہ ظاہر نہیں ہوتی۔ کیوں؟ حکیموں نے صحت وتندرستی کا ایک معیار بنایا ہے، ایک کسوٹی بنائی ہے کہ تندرست کسے کہتے ہیں؟ بیمار کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ جب تندرستی کا معیار معلوم

ہو جائے گا تو بیماری خود بخود معلوم ہو جائے گی۔

آفریقہ میں مجھ سے ایک بیرسٹر صاحب (BARISTER) نے سوال کیا کہ مولانا صاحب! ذرا یہ بتایئے کہ کفر کی کیا تعریف ہے؟ میں نے کہا، جناب! آپ نے سوال غلط کیا ہے، کفر کی کوئی تعریف نہیں ہے، تعریف تو در حقیقت اسلام کی ہے، اسلام کی مخالفت کا نام کفر ہے، اصل میں تعریف آپ کو اسلام کی پوچھنی چاہیے۔ کیونکہ جب اسلام کی تعریف آپ کو معلوم ہو جائے گی تو جہاں جہاں آپ اسکی مخالفت دیکھیں گے سمجھ لیں گے کہ یہ کفر ہے! مخالفتِ کفر کا نام اسلام نہیں ہے بلکہ مخالفتِ اسلام کا نام کفر ہے۔

صحت و تندرستی کا معیار تو میں نے عرض کیا کہ حکیموں نے تندرستی کا ایک معیار متعین کیا ہے۔ شیخ بوعلی سینا کہتے ہیں کہ انسان کے جسم میں چار مادے ہیں، چار اخلاط ہیں۔ خون، بلغم، سودا اور صفراء۔ یہ چاروں مادے جب انسان کے جسم میں کانٹے کی تول کے مطابق ہو اور برابر برابر کام کرتے ہوں اسی کا نام ہم نے تندرستی رکھا ہے۔ جس کا بلغم نہ زیادہ ہو نہ کم ہو، خون نہ زیادہ ہو نہ کم ہو، سودا نہ زیادہ ہو نہ کم ہو، صفراء نہ زیادہ ہو نہ کم ہو وہ تندرست ہے اور اگر بلغم بڑھ گیا یا خون بڑھ گیا یا سودا بڑھ گیا یا صفراء بڑھ گیا تو وہ بیمار ہے۔ یہ تندرستی کا معیار ہے لیکن یاد رکھئے! معیار بنانا تو بہت آسان ہے لیکن اس پر پورا اترنا بہت مشکل ہے۔

جیسے کسی طالب علم نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ میں بڑا آدمی ہو جاؤں گا پھر ایسا کروں گا ویسا کروں گا پھر بادشاہ کی لڑکی سے شادی کروں گا۔ منصوبہ بنانے میں تو کچھ خرچ نہیں ہوتا! کچھ دنوں کے بعد کسی نے کہا کہ جی! آپ نے جو شہزادی سے شادی کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اس کا کیا ہوا؟ کہنے لگے کہ پچاس فیصد کامیابی ہو گئی ہے اور پچاس فیصد کامیابی کا انتظار ہے! پوچھا گیا کہ کیا مطلب؟ کہنے لگے کہ میں تو راضی ہوں، وہ

ابھی تک راضی نہیں ہوئی ہے۔ ارے بھائی! اس پچاس فیصد سے کیا ہوگا جس میں تم راضی ہو۔ کام تو اس پچاس فیصد سے چلے گا کہ جب وہ راضی ہو؟ یہ کون سی کامیابی ہے؟ کہنے لگے کم از کم منصوبہ تو ہم نے بنالیا۔ اس میں کیا حرج ہے؟

حضور اکرم ﷺ کی صحت تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ شیخ بو علی سینا کہتے ہیں کہ تندرستی کیلئے چاروں خلطیں برابر ہونے چاہئیں۔ فرماتے ہیں کہ اب ہم چراغ لیکر نکلے۔ ایک کو دیکھا، دو کو دیکھا، سو کو دیکھا، ہزاروں اور لاکھوں کو دیکھا تو یہ عجیب بات معلوم ہوئی کہ سوائے ایک شخصیت کے آدم کی اولاد میں سے ایک آدمی بھی اس معیار پر پورا نہیں اترا۔ اس کسوٹی پر ایک آدمی بھی تندرست نظر نہیں آیا۔ اور جب ایک آدمی بھی اس معیار پر پورا نہیں اترا تو پھر ہم نے اپنا معیار ہی بدل دیا۔ آج ہم تندرست اسے بھی کہتے ہیں جس کے اخلاطِ اربعہ میں کمی زیادتی تو ہے لیکن بیماری ظاہر نہیں ہوئی ہے۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ آج ہم اور آپ جب تندرست کہلاتے ہیں تو حقیقت میں تندرستی نہیں ہے لیکن بہر حال! جسم پر کوئی بیماری ظاہر نہیں ہوئی ہے اس لئے ہم تندرست کہلاتے ہیں۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی تو اب شیخ بو علی سینا کی زبان سے ہی سن لیجئے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم یہ معیار لیکر نکلے تو کوئی انسان اور کوئی بشر ہمیں ایسا نہیں ملا جس کی چاروں خلطیں برابر کام رہی ہوں صرف ایک ذات اور ایک ہستی ایسی ملی جو مکمل طور پر اس معیار پر اتری ہوئی تھی۔ جسکی چاروں خلطیں برابر کام کر رہی تھی۔ اور وہ محمد عربی ﷺ کی ذاتِ گرامی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو کامل درجہ کی تندرستی عطا فرمائی تھی۔ اور جب تندرستی ہوتی ہے تو چہرہ اور جسم پر رونق بھی ہوتی ہے۔

صحت کی پہچان یہاں یہ بات غور کرنے کی ہے کہ جو آدمی جتنا زیادہ بیمار ہوگا اس کے پیشاب اور فضلہ میں اور اس کے پسینہ میں اتنا ہی سخت قسم کا تعفن اور بدبو

ہوگی اور جو آدمی جتنا کم بیمار ہو گا اس کے پسینہ میں اتنی ہی کم بدبو ہوگی اور جو آدمی بالکل تندرست ہو گا تو کم از کم اس کے پسینہ میں بالکل بدبو نہیں ہوگی۔ جب یہ فلسفہ آپ حضرات کی سمجھ میں آگیا تو اب یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو صحت و تندرستی کا جو اعلیٰ ترین معیار عطا فرمایا تھا اس کی بناء پر اگر یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ کے جسمِ اطہر سے جو پسینہ نکلتا تھا اس میں وہ خوشبو تھی جو گلاب میں بھی نہیں ہوتی تو کوئی مبالغہ نہیں ہو گا (۱)۔ اس لئے کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جو صحت و تندرستی عطا فرمائی تھی وہ آدم کی اولاد میں سے کسی کو نہیں عطا فرمائی۔ اور صرف صحت و تندرستی ہی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ قوتِ جسمانی بھی کامل درجہ کی عطا فرمائی تھی۔

حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ایک شخص تھے جو بعد میں صحابی ہوگئے۔ ان کا نام تھا رکانہ۔ پڑھے لکھے تو کچھ نہیں تھے لیکن پہلوانی کرتے تھے، کشتی لڑتے تھے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! ﷺ میں تو پڑھا لکھا نہیں ہوں، میں نہیں جانتا کہ معجزہ کسے کہتے ہیں، کمالات نبوی کیا ہوتے ہیں؟ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ کشتی میں کون کس کو پچھاڑ دیتا ہے، میری نظر میں جو پچھاڑ دے وہ غالب اور جو پچھڑ جائے وہ مغلوب ہے، اس لئے یا رسول اللہ! ﷺ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے کشتی لڑلیں، اگر آپ مجھے پچھاڑ دیں گے تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا۔ (۲) حضور اکرم ﷺ نے منظور فرمالیا۔ ممکن ہے کہ یہاں آپ لوگ یہ سمجھیں کہ بھائی! یہ بات تو سنجیدگی کے خلاف معلوم ہوتی ہے، نہیں! یہ سنجیدگی کے خلاف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس واقعہ کے ذریعہ یہ سبق دینا مقصود ہے کہ جس ذات کو اللہ تعالیٰ نبوت عطا فرماتے ہیں، جس ذات کو اللہ تعالیٰ رسالت عطا فرماتے ہیں اس ذات میں جہاں اور صلاحیتیں سب سے زیادہ

(۱) بخاری شریف / ۳۲۹۰۔ مسلم / ۴۳۱۱۔ مسند احمد / ۱۱۹۴۷۔ مسند احمد ۱۲۹۳۲۔ (۲) ترمذی شریف

ہوتی ہیں وہیں وہ جسمانی طاقت کے لحاظ سے بھی سب پر فائق ہوتا ہے۔

چنانچہ حضور اکرم ﷺ اور حضرت رکانہ کے درمیان کشتی ہوئی اور تھوڑی ہی دیر میں حضرت رکانہ نیچے ہوگئے اور حضور اکرم ﷺ ان کے اوپر ہوگئے۔ حدیث میں آتا ہے کہ پچھڑنے کی وجہ سے حضرت رکانہ غمزدہ نہیں ہوئے بلکہ انہیں اس بات کی خوشی ہوئی کہ کہاں میری قسمت! آج میرے جسم سے سرکار دوعالم ﷺ کا جسم اطہر لگ گیا ہے۔ اور حضرت رکانہؓ خوش ہوکر حضور اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے۔

بے نفسی کی ایک نادر مثال اندازہ لگایئے کہ حضور اکرم ﷺ کے جسمِ مبارک میں کتنی طاقت ہوگی! اور جب آپؐ کے جسم میں اتنی قوت وطاقت تھی تو میرے دوستو! کیا یہ معجزہ نہیں ہے کہ جب آپؐ اپنا پہلا نکاح کرتے ہیں تو اس خاتون سے کرتے ہیں جو عمر میں آپؐ سے پندرہ سال بڑی ہیں۔ جو دو شوہروں سے بیوہ ہیں اور جن کے دونوں شوہروں سے اولاد بھی ہیں؟ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ نکاح کے وقت حضور اکرم ﷺ کی عمر پچیس سال تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس سال تھی۔ بات غور کرنے کی ہے۔ کیونکہ عورت کیلئے چالیس سال کی عمر تو وہ عمر ہے کہ اگر آج کسی بڑے سے بڑے متقی سے یہ کہا جائے کہ جی! وہ فلانی خاتون! ہیں تو کنواری باقی ان کی عمر چالیس سال کی ہے کیا آپ ان سے شادی کریں گے؟ تو وہ ہاتھ جوڑ کر کہے گا کہ نہ بھائی! میں نہیں کرتا۔ جبکہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اس وقت نکاح فرمایا جب آپؐ کی عمر پچیس سال تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس سال تھی نیز وہ دو شوہروں سے بیوہ بھی تھیں۔

میرے دوستو! کیا بے نفسی کی یہ مثال اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے کوئی قائم کرکے بتا سکتا ہے؟ (سیرت کی یہ تقریر کیسٹ میں ہمیں مکمل نہیں ملی ادھوری ہی ملی۔ جس کے بناء پر بقیہ تقریر نہ پیش کرنے پر ہم معذرت خواہ ہیں)

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ
وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ
سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون
وسلام علی المرسلین
والحمد للّٰہ رب العلمین۔
برحمتک یاارحم الراحمین۔



سالِ نو کا پیغام

مال طیب کا ایک ترجمہ ہے لذیذ لذیذ کھانا ۔ عمدہ عمدہ کھانا اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو آزادی عطا فرماتے ہیں تو پھر اس کے نتیجہ میں قدرتی طور پر خوشحالی اور فراغت بھی مل جاتی ہے اور پہلے سے زیادہ بہتر قسم کے کھانے ملنے لگتے ہیں، اچھے قسم کے کپڑے پہننے لگتے ہیں، اچھے قسم کے مکان استعمال کرنے لگتے ہیں۔ مال طیب کا دوسرا ترجمہ ہے "حلال سے اونچا درجہ" مالِ حلال اس مال کو کہتے ہیں جسکو اللہ تعالیٰ نے جائز قرار دیا ہو اور قرآن وحدیث میں اسکی ممانعت نہ فرمائی ہو۔ جیسے آٹا، گندم، چنا، باجرا، ان چیزوں کی ممانعت نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں ہے، اس کو حلال کہتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کسی کے کھیت سے گندم چُرا کرلے آئے تو یہ گندم (فی نفسہ) حلال تو ہے لیکن مالِ طیب نہیں ہے، اس لئے کہ مال طیب اس مال کو کہتے ہیں جس مال سے کسی انسان کا حق وابستہ نہ ہو، اپنی جگہ پر گندم تو بے شک حلال ہے لیکن یہ کہ یہ مال طیب نہیں ہے اس لئے کہ دوسروں کے اوپر ظلم کرکے اور دوسروں کی حق تلفی کرکے تم نے اِسے حاصل کیا ہے۔

تو اگر اللہ تعالیٰ کسی کو ایسا رزق عطا فرمادے کہ جو حلال بھی ہو اور اس سے کسی انسان کی حق تلفی بھی وابستہ نہ ہو، بغیر کسی کی حق تلفی کے اللہ تعالیٰ عطا فرمادے تو اس سے بڑھ کر ایک مسلمان کیلئے کوئی دولت نہیں ہو سکتی۔ (ارشاد حضرت خطیب الامت)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سالِ نو کا پیغام

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّهْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحٰبِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

اَمَّا بَعْدُ. فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَاذْكُرُوٓا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِى ٱلْأَرْضِ تَخَافُونَ
أَن يَتَخَطَّفَكُمُ ٱلنَّاسُ فَـَٔاوَىٰكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِۦ وَرَزَقَكُم
مِّنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٢٦﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟
لَا تَخُونُوا۟ ٱللَّهَ وَٱلرَّسُولَ وَتَخُونُوٓا۟ أَمَٰنَٰتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ
﴿٢٧﴾ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّمَآ أَمْوَٰلُكُمْ وَأَوْلَٰدُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ ٱللَّهَ
عِندَهُۥٓ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٢٨﴾　　سُوْرَةُ الْاَنْفَال

صَدَقَ اللّٰہُ مَوْلَانَا الْعَظِیْمُ وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ وَنَحْنُ عَلٰی ذٰلِکَ مِنَ الشَّاھِدِیْنَ وَالشَّاکِرِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

ابتدائیہ بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! آج جس نئے مہینہ میں ہم اور آپ موجود ہیں اس مہینہ کو اسلامی جنتری میں محرم الحرام کے نام کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس مہینہ سے ہمارا سال، ہماری جنتری اور ہمارا سن تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر آپ محرم سے پہلے ۱۳۸۴ھ میں تھے تو اب اس محرم کی پہلی تاریخ سے آپ ۱۳۸۵ھ میں داخل ہو گئے۔ یہ مہینہ اور اس مہینہ سے شروع ہونے والا سنہ اور سال اسلام کی تاریخ کے ایک اہم واقعہ سے متعلق ہے۔ کبھی کبھی اس کو دہرا لینا چاہئے اور یاد کر لینا چاہئے۔

ماہ محرم سے اسلامی سنہ کے آغاز کا نکتہ دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہئے کہ جب کوئی قوم اپنی تاریخ شروع کرتی ہے تو اس کا مقصد بھی دراصل یہی ہوتا ہے کہ جب جب یہ سال تبدیل ہو گا یہ واقعہ آنکھوں کے سامنے آتا رہے گا اور اس واقعہ کی یاد تازہ ہوتی رہے گی۔ تاریخ کا مقصد یہی ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ "لفظ تاریخ" عربی لفظ ہے اور

یہ ارخ سے بنا ہوا ہے۔ ارخ کے معنی آتے ہیں، کسی عمل اور کسی فعل کی اہمیت کی وجہ سے اس عمل اور فعل کے وقت کو متعین کر دینا۔ مثلاً طوفان نوح آیا، کس دن آیا؟ کس تاریخ میں آیا؟ جب آپ اس دن اور تاریخ کو مقرر اور متعین کر دیتے ہیں، تو اسی کا نام تاریخ ہے۔

تمام قوموں نے اپنے سنہ کا آغاز کسی اہم واقعہ سے کیا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب طوفان آیا تو اس دور میں یہ سب سے اہم واقعہ تھا اس لئے لوگوں نے طوفانِ نوح سے تاریخ لکھنا شروع کر دیا۔ ان کا مقصد اس سے یہ تھا کہ اگلے سال آج ہی کے دن جب یہ سال تبدیل ہوگا تو پھر ہمارے لئے طوفانِ نوح کا یہ واقعہ تازہ ہو جائے گا، پھر دو سال کے بعد تازہ ہوگا پھر تین سال کے بعد تازہ ہوگا اسی طریقہ سے جب تک یہ سنہ لکھا جائے گا یہ واقعہ تازہ ہوتا رہے گا۔

دنیا کی مختلف قوموں نے اپنا سنہ اور اپنی تاریخ مقرر کرنے کیلئے اپنے اپنے مذاق کے مطابق واقعات کو منتخب کیا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ دیکھا کہ ہم زمیندار ہیں اور زمین کی پیداوار سے ہمارا کاروبار چلتا ہے، ہماری زندگی چلتی ہے تو انہوں نے فصلی تاریخیں لکھنی شروع کیں۔ یعنی جب موسم آتا ہے یا تبدیل ہوتا ہے وہاں سے اپنا سنہ اور سال لکھتے ہیں اور اسکو سنۂ فصلی کہتے ہیں۔ جیسے بعض جنتریوں کے اندر آپ نے دیکھا ہوگا کہ جہاں اس میں عیسوی تاریخیں لکھی ہوتی ہیں، اسلامی تاریخیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں وہیں ساتھ ساتھ فصلی تاریخیں بھی لکھی ہوتی ہیں۔

بعض قوموں نے اپنے بادشاہ کی تخت نشینی اور تاج پوشی کی رسم کی ادائیگی کے واقعہ کو اہم سمجھا چنانچہ انہوں نے وہیں سے اپنے سنہ کو لکھنا شروع کیا اور اسی واقعہ کو مبدء تاریخ بنایا، اس سنہ کو سنۂ جلوس کہتے ہیں، سنۂ جلوس کے معنی ہیں تخت نشینی کا سال، تو اس واقعہ کو یادگار بنانے کیلئے تاریخ کو وہیں سے شروع کر دیتے ہیں۔

اسی طرح سے بعض قوموں نے اپنی تاریخ اس وقت سے شروع کی جب سے کہ ان کے نبی اور پیغمبر دنیا میں تشریف لائے، ولادت نبی سے انہوں نے اپنی تاریخ شروع کی۔ جیسا کہ نصاریٰ۔ بعض دوستوں نے مجھ سے یہ کہا کہ نصرانی اور عیسائی لوگ جو تاریخ لکھتے ہیں، جس کو عیسوی تاریخ کہتے ہیں یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک صحابی کو جو جواب دیا ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ تاریخ میلادی ہے وفاتی نہیں ہے۔

اسلامی سنہ میلادی نہیں سنہ ہجری ہے واقعہ یہ پیش آیا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک تحریر آئی جو لین دین کے معاملہ سے متعلق تھی۔ جس پر ادائیگی کا مہینہ شعبان لکھا ہوا تھا، لیکن اس پر سنہ نہیں لکھا گیا تھا، اور اسکی وجہ شاید یہ ہوگی کہ ابھی تک مسلمانوں نے اجتماعی طور پر یہ طے نہیں کیا تھا کہ ہمیں کونسا سنہ لکھنا چاہیے۔ البتہ بعض لوگ اپنی تحریروں میں سنہ کے طور پر عام الفیل کو لکھتے تھے۔ یعنی جب ہاتھیوں کا لشکر خانہ کعبہ کو گرانے اور منہدم کرنے کیلئے آیا جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کو تقریباً پونے دو مہینے ہوچکے تھے، اس سنہ کو عام الفیل کہا جاتا تھا یعنی ہاتھیوں کے لشکر کا سال، اسی طرح عام الفیل کا دوسرا سال، تیسرا سال، چوتھا سال۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عام الفیل کے پہلے سال میں پیدا ہوئے۔ (۱)

اور بعض لوگ سنہ کی ابتدا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کیا۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی اور رسول بنایا اس وقت سے اپنے سنہ کی ابتدا، اور اسکا آغاز کیا، جسکو سنہ نبوی کہتے تھے، سنہ نبوی کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی نبوت کا یہ پہلا سال ہے۔

---

(۱) ترمذی / ۳۵۵۲۔ مسند احمد ۱۶۲۱۸

یہ دوسرا سال ہے، یہ تیسرا سال ہے۔

اسی طریقہ سے مختلف طور پر لوگ سنہ لکھا کرتے تھے، کیونکہ ابھی یہ طے نہیں ہوا تھا کہ مسلمان بحیثیت مسلم قوم کے کونسا سنہ اور کونسا طریقہ تاریخ اختیار کریں۔

چنانچہ اس تحریر کے متعلق شبہ پیدا ہو گئی کہ اس کے اندر لکھی ہوئی چیز کی ادائیگی سال گذشتہ کے شعبان میں ہو گئی ہے یا آئندہ سال کا جو شعبان آنے والا ہے اس میں اسکی ادائیگی ہوگی، اس لئے کہ اس میں سنہ نہیں لکھا ہوا تھا۔ حضرت عمر فاروق ؓ نے صحابہ کرام ؓ کو جمع کیا اور یہ مشورہ کیا کہ ہمیں بھی کوئی ایک سنہ اپنا لینا چاہیے جسے ہم اسلامی سنہ کہیں۔

سنہ ہجری کی وجہ ترجیح چنانچہ صحابہ کرام ؓ جمع ہو گئے، ایک صحابی نے مشورہ دیا کہ اسلامی سنہ کو حضور اکرم ﷺ کی پیدائش اور آپؐ کی ولادت سے شروع کیا جائے، بعض لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ ہمیں سنہ نبوی اختیار کرنا چاہیے۔ یعنی جب سے اللہ تعالیٰ نے سرکار دوعالم ﷺ کو نبوت سے سرفراز کیا ہے اس وقت سے اسلامی تاریخ کا آغاز کرنا چاہیے، بعض لوگوں نے یہ رائے دی کہ ہمیں عام الفیل کو اختیار کرنا چاہیے، اور بعضوں نے کچھ اور رائے دی۔

جن لوگوں نے یہ رائے دی تھی کہ اپنا سنہ حضور اکرم ﷺ کی ولادت سے شروع کرنی چاہیے، حضرت عمر فاروق ؓ نے ان کو یہ جواب دیا کہ ہم سنہ ولادت کو اختیار نہیں کر سکتے کیونکہ نصاریٰ اپنا سنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے شروع کرتے ہیں، اگر ہم بھی حضور ﷺ کی پیدائش سے اپنا سنہ لکھنا شروع کر دیں تو نصاریٰ کے ساتھ مشابہت ہو جائے گی، لہذا ہم سنہ ولادت اختیار نہیں کر سکتے۔

اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سنہ عیسوی درحقیقت پیدائش کا سنہ ہے، وفات کا سنہ نہیں ہے، اسی لئے عربی کتابوں میں اس سنہ کو سنہ میلادی لکھتے ہیں۔ میلاد کے معنی

ہیں "پیدائش"۔ سنہ میلادی کا مطلب یہ ہے کہ وہ سنہ جو کسی کی پیدائش سے متعلق ہے۔ سنۂ عیسوی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے متعلق ہے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی نے سنہ فصلی اختیار کیا، کسی نے سنہ جلوسی اختیار کیا، کسی نے طوفانِ نوح سے اپنی تاریخ کا آغاز کیا، کسی نے مکہ مکرمہ لشکر کشی کے واقعہ کو مبدا ، تاریخ بنا کر سنہ عام الفیل اختیار کیا۔ تو مسلمانوں کے سامنے یہ سوال پیش آیا کہ ہمیں کونسا سنہ اختیار کرنا چاہیے؟ ہمیں اپنی تاریخ کی ابتداء کہاں سے کرنی چاہیے؟

بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو اسی وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو یہ حکم دے دیا تھا کہ تم اپنی تاریخ اور اپنے سنہ کو میرے ہجرت کے واقعہ سے شروع کرنا۔ لیکن صحیح قول یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ بات واضح اور صاف نہیں تھی، اسی لئے کوئی ایک سنہ لکھ رہا تھا کوئی دوسرا سنہ لکھ رہا تھا اور کوئی تیسرا سنہ لکھ رہا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا سنہ بھی چھٹی صدی لکھا جا رہا ہے اس لئے کہ تقریباً پونے چھ سو سال کا عرصہ گذرا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے، تو چھٹی صدی عیسوی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی، بعض لوگوں نے تو مہینہ کا نام، تاریخ اور سنہ بھی لکھا ہے جو اس وقت مجھے یاد نہیں ہے لیکن یہ کہ وہ چھٹی صدی عیسوی ہے۔

تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ بات صاف نہیں تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ مسئلہ پیش آیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم اپنا سنہ حضورؐ کی تاریخ ولادت سے اس لئے نہیں شروع کر سکتے کہ نصاریٰ کے ساتھ تشبہ ہوگا۔ اور تاریخ نبوی کو بھی مبداء تاریخ اسلامی قرار دینا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایک طرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی تو دوسری طرف مسلمانوں کے اوپر تکلیف اور مصیبتوں کا دور شروع ہو گیا، کیونکہ اسلام کو قبول کرنا تھا کہ مسلمانوں کے اوپر تکالیف ہی تکالیف،

مصیبتیں ہی مصیبتیں ڈھائی گئیں، چنانچہ مسلمانوں کیلئے مکہ کی تیرہ سالہ زندگی کا زمانہ بڑا سخت اور بڑا شدید زمانہ تھا۔ لہذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس واقعہ (نبوت) کو بھی یادگار نہیں بنانا چاہیے۔ پھر کس واقعہ کو یادگار بنانا چاہیے؟

فرمایا کہ اس واقعہ کو یادگار بنانا چاہیے کہ جہاں سے مسلمانوں کا عروج اور مسلمانوں کی سربلندی شروع ہوتی ہے، اور مسلمانوں کے عروج اور سربلندی کا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت فرماکر مدینہ منورہ تشریف لائے۔ چنانچہ اسی واقعہ کو مبداء تاریخ اسلامی بنایا گیا اور اس سنہ کا نام سنۂ ہجری قرار پایا۔ اور آج اس سنہ کا ۱۳۸۵ واں سال ہے، جسکا مطلب یہ ہے کہ آج اس واقعہ کو ۱۳۸۴ھ سال اور کچھ دن گذرے ہیں جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت فرماکر مدینہ منورہ تشریف لائے۔ جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ مسلمانو! جب محرم کا چاند نکلا کرے تو ہجرت کے اس خونیں داستان کو یاد کرلیا کرو کہ جب تمہارے آباء واجداد مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لائے تھے۔

اسی لئے میں بعض دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ جب چاند نکلتا ہے تو وہ باتیں بھی کرتا ہے خاص طور پر عید کا چاند جب نکلتا ہے تو وہ بات کرتا ہے بشرطیکہ سننے والے کے اندر اس کے سمجھنے کی قوت اور صلاحیت موجود ہو، ایک عاشق جب عید کا چاند دیکھتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ یہ چاند جو نکل رہا ہے دراصل یہ میرا مذاق اڑا رہا ہے کہ تو عید کا چاند دیکھ رہا ہے لیکن ایسے موقعہ پر بھی تیرا محبوب تیرے پاس نہیں ہے، یعنی وہ میری جدائی کا مذاق اڑا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ؎

بلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے
پیامِ عیش ومسرت ہمیں سناتا ہے

درحقیقت عید کا چاند کوئی مذاق نہیں اڑاتا ہے لیکن دیکھنے والا کہتا ہے کہ چاند

کو دیکھ کر مجھے سب کچھ یاد آرہا ہے۔ تو یہ خوشی کا پیغام لیکر آیا ہے جبکہ میرا محبوب میرے پاس نہیں ہے۔ میں اپنے محبوب سے جدا ہوں۔ اسی حالت میں کا خوشی پیغام لانا گویا میرا مذاق اڑانا ہے۔

محرم کا چاند ہجرت کی یاددہانی کرتا ہے اسی طرح سے جب محرم الحرام کا چاند نکلتا ہے تو وہ چاند مسلمانوں سے خطاب کر کے یہ کہتا ہے کہ اے مسلمانو! تم مجھے دیکھو اور ہجرۃ النبی ﷺ کا واقعہ یاد کرو، اس لئے کہ آج سے تمہارا سنہ اور سال تبدیل ہو رہا ہے، آج سے تمہاری جنتری تبدیل ہو رہی ہے۔ اور صرف یہی نہیں کہ ہجرت کے واقعہ کو یاد رکھا جائے بلکہ ان تکلیفوں کو بھی یاد رکھنا چاہیے جو تکلیفیں آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مکہ میں اٹھائیں اور جب ان تکلیفوں کی وجہ سے مکہ کے اندر زندگی دشوار ہو گئی تو حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ اجازت دے دی کہ آپ لوگ ترکِ وطن کر کے چلے جائیں۔ لیکن کہاں جائیں؟

بعض روایتوں میں آتا ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ کو تین مقامات دکھلائے گئے۔ سب سے پہلے مدینہ منورہ کا علاقہ دکھلایا گیا، اگرچہ اس وقت اس علاقہ کا نام مدینہ منورہ نہیں تھا، حدیث میں جو لفظ ہے وہ یہ ہے کہ ایسا مقام دکھلایا گیا جہاں کھجوروں کے درخت تھے، دوسرا علاقہ غالباً بحرین کا علاقہ تھا اور تیسرا ایک اور علاقہ تھا۔ حضور اکرم ﷺ کو یہ تینوں علاقے دکھلائے گئے تھے (۱)، جسکا مطلب یہ ہے کہ ہجرت کرنا یعنی ترک وطن کر کے دوسرے علاقوں میں چلا جانا یہ نبیوں اور پیغمبروں کی وہ سنت ہے جو تمام انبیاء کرام کو پیش آئی ہے۔

ہجرت کرنا پیغمبروں کی سنت ہے وجہ اسکی یہ ہے کہ نبی اور پیغمبر ایک ایسی ذات اور ایک ایسی ہستی کا نام ہے جو کبھی باطل کے ساتھ مصالحت نہیں کرتی بلکہ

(۱) بخاری شریف باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

انبیا کرام علیہم السلام ہمیشہ حق کی آواز کو بلند کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں ان کو اپنے عزیزوں کو چھوڑنا پڑتا ہے، اپنے وطن کو چھوڑنا پڑتا ہے اور جہاں ان کی آواز قبول کئے جانے کے امکانات ہوتے ہیں وہاں ان کو جانا پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کیلئے تین مقامات دکھلائے گئے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو یہ اجازت دے دی کہ آپ ترک وطن کر کے جاسکتے ہیں۔ ادھر مدینہ منورہ کا یہ حال ہے کہ یہ یہودیوں کی بستی ہے، نبوت کے گیارہویں سال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہاں سے کچھ یہودی آئے اور اسلام قبول کئے پھر مدینہ منورہ چلے گئے، اسی واقعہ سے نبوت کے گیارہویں سال میں مدینہ کے اندر اسلام کی ابتداء ہو چکی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت آسمانی کتابیں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہرت کو تو سنتے تھے لیکن اب تک انہوں نے مکہ آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات نہیں کی تھی، انہیں میں سے یہود کے ایک بڑے زبردست عالم ہیں، جنکا نام "عبداللہ ابن سلام" ہے۔ احبار یہود میں یہ بڑے زبردست پایہ کے عالم ہیں۔ (۱) یہاں ایک بات میں آپ حضرات سے یہ بھی عرض کردوں کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں اس وقت اہل کتاب میں سے "زبور" کے ما ے دنیا میں موجود نہیں تھے۔ "زبور" بھی آسمانی کتابوں میں سے ایک کتاب ہے۔ بعثت نبوی کے وقت اس کے ماننے والے صفحہ ہستی پر موجود نہیں تھے، اہل کتاب میں سے صرف دو گروہ رہ گئے تھے۔ ایک توریت کو ماننے والے، دوسرے انجیل کو ماننے والے۔ توریت کو ماننے والے یہودی ہیں، انجیل کو ماننے والے نصاریٰ ہیں، یہ دونوں کے دونوں آسمانی کتاب اور آسمانی نبی و پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں، اسی لئے یہ دونوں اہل کتاب کہلاتے ہیں۔

(۱) بخاری شریف باب مناقب عبد اللہ بن سلام /۳۶۲۱۔ مسند احمد /۱۲۰۲۸

مسلمانوں کے علاوہ سب پر کافر کا اطلاق ہو گا

جب حضور اکرم ﷺ تشریف لائے ہیں اس وقت یہود ونصاریٰ کی یہ دونوں جماعتیں موجود تھیں۔ یہ لوگ حضور ﷺ کے اوپر ایمان نہیں لائے۔ اسی لئے یہ دونوں کے دونوں گمراہ ہیں اور اہل کتاب میں سے ہونے کے باوجود کافر ہیں۔ اور کافر کا لفظ ایسا ہے کہ اس کا اطلاق دونوں اہل کتاب یہود ونصاریٰ پر بھی ہوتا ہے اور مشرکین پر بھی ہوتا ہے۔ تینوں پر یہ لفظ بول دیا جاتا ہے۔ تو " اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا " جب کہا جاتا ہے تو مشرکین بھی، یہود بھی، نصاریٰ بھی، سب کے سب مراد ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ جس نے نبی آخرالزماں پر ایمان لانے سے انکار کر دیا تو چاہے وہ اہل کتاب میں سے ہو، چاہے وہ مشرکین میں سے ہو وہ کافر کہلائے گا۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کی بعثت کے وقت یہ دونوں جماعتیں موجود ہیں مگر ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ فرق یہ ہے کہ نصاریٰ کے پاس نہ علم تھا اور نہ ان کے پاس کوئی عالم موجود تھے۔ صحیح بات بتانے والا کوئی موجود نہیں تھا۔ ان کی حالت اس آدمی کی طرح ہو گئی تھی جو جنگل میں بھٹکتا پھرتا ہے جسکو راہ بتانے والا کوئی نہیں ہے۔ دراصل راستہ کا جاننے والا ہی کوئی نہیں ہے تو راستہ بتائے کیسے؟

او خویش گم است کرا رہبری کند

نصاری ضال اور یہودی مغضوب قوم ہے

ان کے پاس نہ علم تھا نہ کوئی عالم تھا جس کی وجہ سے ان کو دین کا صحیح علم نہیں تھا۔ اسی لئے قرآن کریم نے ان کو " ضالین " کہا ہے۔ ضَآلِّیْنَ کے معنی ہیں راستے سے بھٹکے ہوئے۔ وہ لوگ جنکو راستہ کا پتہ نہیں ہے۔ جنکو منزل کا پتہ بھی نہیں ہے۔ لیکن یہود کی حیثیت یہ تھی کہ ان کے اندر صحیح معنی میں علم بھی موجود تھا۔ علماء بھی موجود تھے۔ ان کو صحیح راستہ بتانے والے بھی موجود تھے۔ لیکن ان کے علماء کی اکثریت ایسی تھی کہ وہ تھوڑے تھوڑے بدلے کے عوض، معمولی

سے معمولی اور حقیر معاوضہ کے بدلے میں اللہ کے احکام کو بیچ دیا کرتے تھے، حالانکہ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہم جو کام کررہے ہیں وہ ہمارے دین کے اعتبار سے بالکل غلط ہے۔ یہ یہود کی حالت تھی۔

اب اگر کسی کو یہی پتہ نہ ہو کہ ہم جس راستہ پر جارہے ہیں وہ جہنم کا راستہ ہے لیکن تیزی سے چلا جارہا ہے۔ تو اللہ کے یہاں وہ پھر بھی کسی نہ کسی درجہ میں معذور ہے، اس لئے کہ اس کو منزل کا پتہ ہی نہیں ہے، اس کو کوئی راستہ بتانے والا ہی نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہے کہ جس راستہ پر ہم جارہے ہیں وہ جہنم کا راستہ ہے، جنت کا راستہ نہیں ہے اس کے باوجود لالچ کی وجہ سے ادھر چلا جارہا ہے تو اللہ کی نظروں میں وہ سب سے زیادہ غضب الٰہی کا مستحق ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہود کے متعلق کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے غضب کے مستحق ہوئے، اور نصاریٰ کے متعلق یہ کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو صحیح راستہ سے بھٹکے ہوئے ہیں فرمایا کہ۔

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ
الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ﴿٧﴾

"ان لوگوں کے راستہ سے تو ہم کو بچائے رکھ جن پر تیرا غضب نازل ہوا ہے"

وہ کون لوگ ہیں؟ وہ یہود ہیں! قرآن کریم میں ایک اور جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ یہ لوگ غضب الٰہی کے مستحق ہوگئے فرمایا کہ۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُو بِغَضَبٍ مِّنَ
اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ
النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿٦١﴾

یہ لوگ گناہ کرتے کرتے حد سے تجاوز کرنے لگے، نبیوں کو قتل کرنے لگے اور اللہ کی آیتوں کا انکار کرنے لگے، جسکی وجہ سے یہ لوگ خدا کے غضب کے مستحق ہوگئے

اور اللہ نے ان کے اوپر غضب نازل کیا، نیز بے وقاری اور ذلت ان کے اوپر مسلط کردیا۔

اور جیسا کہ میں نے عرض کیا یہود کے پاس علم بھی تھے لیکن وہ دین فروش اور ضمیر فروش تھے، اسی طرح اسلام میں بھی ایسے ایسے زمانے اور ایسے ایسے دور آئے ہیں کہ جن میں بعض لوگوں نے جان بوجھ کر دیدہ و دانستہ دیندانستہ دین اسلام کو بیچنے کی کوشش کی ہے لیکن ہر دور میں اللہ کے ایسے ایسے حق گو بندے بھی موجود تھے اور قیامت تک موجود رہیں گے جنکی بدولت اللہ نے دین اسلام کو بچایا اور اسکی حفاظت کی۔

اکبر کا دینِ الٰہی علمائے سوء کا دین تھا اکبر کے زمانے میں جن لوگوں نے دین الٰہی کا ایجاد کیا، اور اکبر کیلئے ایک نیا دین بنایا۔ یہ وہی لوگ تھے جو اس کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، ان میں بعض بڑے بڑے ذی علم علماء بھی تھے۔ ایک شخص تھا جسکا نام لکھا ہے "ملا مبارک ناگوری"، اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ فن حدیث کا اتنا بڑا زبردست عالم تھا کہ حافظ ابن حجرؒ عسقلانی اور اس عالم کے درمیان صرف دو دو واسطے ہیں، اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ علمِ حدیث کے بہت بڑے امام ہیں۔ اب آپ اندازہ لگایئے کہ جو صرف دو واسطوں سے اتنے بڑے امام کا شاگرد ہو اسکا علمی مقام کتنا اونچا ہوگا! لیکن باوجود اس کے کہ یہ اتنا بڑا عالم ہے اور آگرہ کے اندر ایک بہت بڑی یونیورسٹی (UNIVERSITY) قائم کیا تھا مگر اس کے اندر خوف خدا اور خشیت الٰہی نہیں تھی۔ اس نے اپنے علم سے اسلام اور مسلمانوں کو یہ نقصان پہنچایا کہ اکبر کے اشارہ پر قرآن کریم کی تفسیر لکھی۔ اور اس تفسیر کے اندر وہ اللہ کے منشاء کو نہیں لکھتا تھا، اکبر بادشاہ کے منشاء کو لکھتا تھا، جس کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں اس کا مقام یہ تھا کہ مُلّا مبارک ناگوری دین الٰہی قائم کرکے برباد ہوگیا۔

اکبر کے دور میں علمائے حق ملا مبارک ناگوری کے شاگردوں میں سے ملا عبد القادر

بدایونی ایک بڑے عالم ہیں۔ "بدایوں" کے رہنے والے ہیں۔ اور بدایوں میں بعض خاندان دور قدیم سے بڑے ذی علم خاندان چلے آئے ہیں۔ ملا عبد القادر بدایونی انہیں میں سے ایک خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ملا مبارک ناگوری کے شاگرد ہونے کے باوجود جب اللہ نے عقل عطا فرمائی تو سمجھ گئے کہ ہمارا استاذ جو ہے وہ دین فروش ہے۔ ضمیر فروش ہے۔ انہوں نے تاریخ کی ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں جب اپنے استاذ کا تذکرہ کیا ہے تو انتہائی بُرے اور سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ لکھا ہے کہ ؎

تو اے مرد سخن پیشہ زبہر چند مستی دوں
زدین حق بماندستی بہ نیروئے سخن دانی

مُلا عبد القادر اپنے استاذ کو کہتا ہے کہ تو مرد سخن پیشہ ہے۔ تیرا پیشہ اور تیرا کام باتیں بنانا ہے۔ تھوڑے سے مفاد کے خاطر تو نے اللہ کے دین سے منہ موڑ لیا ہے۔ تھوڑے سے فائدے کے خاطر اللہ کے دین کو چھوڑ کر اہل باطل کی طرف تو چلا گیا ہے۔

چہ سستی دیدی از سنت کہ رفتی سوئے بے دیناں
چہ تقصیر آمداز قرآن کہ گردی گرد الآنی

اے مُلا مبارک ناگوری! تجھے قرآن و سنت میں کیا خامی نظر آئی ہے کہ تو بددینوں کی طرف چلا گیا؟ تو نے اپنا مذہب پلیٹ اور چمچہ کو بنالیا ہے؟ دنیا کے محدود فائدہ کیلئے تو نے دین کی صورت بگاڑ کر رکھ دی ہے۔

میرے دوستو! تاریخ کے ہر دور میں کچھ لوگ ایسے رہے ہیں جنہوں نے اسلام کی شکل کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ کہ اس کی آب و تاب میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اور آئندہ بھی نہیں آئے گا۔ آجکل جو لوگ دین کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں بھی یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارے بگاڑنے سے دین کا کچھ نہیں بگڑے گا ۔البتہ ہم خود بگڑ جائیں گے۔

اسلامی قانون میں تبدیلی ناممکن ہے ایک مرتبہ حضرت مولانا تھانوی علیہ الرحمہ غالباً انجمن حمایت الاسلام لاہور کے جلسہ میں تشریف لے گئے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ جب میں لاہور پہنچا تو میرے پاس چند تعلیم یافتہ حضرات آئے جن میں کچھ بیرسٹر (BARRISTER) اور وکیل بھی تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا صاحب! آپ کب تک لکیر کے فقیر بنے رہیں گے؟ دیکھئے! ہماری ہمسایہ ہندو قوم سود کے ذریعہ ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور آپ لوگ اب تک سود کو حرام قرار دے رہے ہیں؟ لیجئے! ہم آپ کے پاس ایک تحریر لائے ہیں جس میں سود کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ آپ بھی اس پر دستخط کر کے سود کو حلال قرار دیں۔ مولانا نے فرمایا کہ میں آج رات کے جلسہ میں اس موضوع پر تقریر کروں گا۔ لیکن ان کو استفادہ کرنا تو تھا نہیں۔ دراصل ہر دور میں ایک جماعت ہوتی ہے جو ہمہ وقت علماء کو اغوا کرنے کیلئے سرگرم رہتی ہے۔ اور یہ جماعت علماء کو اغوا کرنے میں ابلیس اور شیطان سے بھی زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جب ابلیس بہکاتا ہے تو علماء یہ پہچان لیتے ہیں کہ یہ جو مجھے بہکا رہا ہے یہ ابلیس اور شیطان ہے۔ لیکن بعض اوقات ایک مہذب انسان کی شکل میں وہ اغوا کرنے کیلئے آتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ جو کبھی ابلیس سے دھوکہ نہیں کھاتے وہ بھی ان مہذب شکل انسانوں سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

بہرحال! وہ لوگ آئے اور مسلمانوں کی بدحالی کا انہوں نے ایسا نقشہ کھینچا کہ مسلمان سود سے بچ کر **سبب** کے سب **غربت میں** مبتلا ہو گئے جبکہ ہماری ہمسایہ **قوم سود** کے ذریعہ ترقی کر کے کہیں سے کہیں چلی گئی **اور** آپ ابھی تک **"بسم اللہ کے گنبد" میں** بیٹھے ہوئے ہیں اور سود کو حرام قرار دیتے ہیں۔

مولانا نے فرمایا کہ وکیل صاحب! میری ایک بات سن لیجئے، وہ یہ کہ اگر میں آپ کے کہنے کے مطابق **اس تحریر پر** دستخط کر **دیتا ہوں تو** کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ

اشرف علی کے دستخط کرنے سے سود حلال ہو جائے گا؟ اگر آپ کا یہ ایمان ہے کہ اشرف علی کے دستخط کر دینے سے سود حلال ہو جائے گا تو آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ایسے ایک لاکھ سے بھی زیادہ آدمی اب تک پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے زمانے میں اللہ کے دین کو بدلنے کی کوشش کی مگر دین تو اپنی جگہ باقی رہا وہ لوگ خود بدل گئے۔ فرمایا کہ اگر آپ کے کہنے کے اوپر میں دستخط کر دوں گا تو میں آپ کو یہ یقین دلا دینا چاہتا ہوں کہ اگر اشرف علی حرام کے حلال ہونے پر یا حلال کے حرام ہونے پر دستخط کر بھی دے گا تو حلال اپنی ہی جگہ اور حرام اپنی ہی جگہ رہے گا لیکن اشرف علی اپنی جگہ پر باقی نہیں رہے گا۔ فرمایا کہ یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ وہ کبھی نہیں بدلتا لیکن اس کے بدلنے والے خود بدل جاتے ہیں۔ لہذا آپ جو سوچ رہے ہیں اس کو بھول جایئے۔

تو بھائی! میرے عرض کرنے کا منشا، یہ ہے کہ اسلام کے اندر ایسے ایسے زمانے بھی گذرے ہیں کہ جس میں دین کے اندر ردو بدل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن ہمیشہ اللہ کے حق گو بندے بھی ایسے رہے ہیں جنہوں نے اللہ کے دین کی حفاظت کی ہے۔

قاضی شریح کا واقعہ خلفائے بنو عباسیہ کے زمانے میں ایک بڑے پایہ کے عالم گذرے ہیں، ان کا نام قاضی شُریح تھا، یہ وہ قاضی شریح نہیں ہیں جن کے پاس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زرہ کا مقدمہ پہنچا تھا، وہ دوسرے قاضی تھے، یہ ایک بڑے عالم ہیں۔ اور جس طرح دوسرے بہت سے علماء خراب کر دیئے گئے، تباہ و برباد کر دیئے گئے وہی حال ان کا بھی ہوا۔ لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو بچانے کی بہت کوشش کی اور ہمیشہ اسی فکر میں رہتے تھے کہ کہیں مجھے خراب نہ کر دیا جائے۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی پر جو کتاب لکھی ہے اس میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ قاضیِ شریح کے پاس خلیفۂ وقت کا دعوت نامہ آیا، اس میں خلیفہ نے یہ لکھا تھا کہ دو باتوں میں سے ایک بات آپ کو قبول کرنی پڑے گی۔ یا تو آپ میرے

بچوں کو تعلیم دیں۔ معلم الصبیان " کا عہدہ قبول کرلیں؛ اور اگر آپ اس کیلئے تیار نہیں ہیں تو کم از کم ایک سرکاری دعوت قبول کرلیں؛ میں نے سرکاری دعوت کہا، گھر کی دعوت نہیں کہا۔ اس لئے کہ سرکاری دعوت میں اتنے انتظامات ہوتے تھے اور اتنا اعلیٰ اور بہترین طریقے پر کھلایا جاتا تھا کہ ایک دفعہ کھانا کھانے کے بعد پھر دوبارہ واپس آنے کی خواہش کرے۔ تو قاضی شریح سے کہا گیا کہ یا تو آپ معلم الصبیان کا عہدہ قبول کرلیجئے یا سرکاری دعوت قبول کرلیجئے؛ انہوں نے سوچا کہ معلم الصبیان کا عہدہ قبول کرنا اور اس کیلئے روز روز خلیفہ کے گھر جانا بڑا مشکل ہوجائے گا لہذا چلو ایک مرتبہ اسکی دعوت کو قبول کرلو۔ آخر دن میں ایک مرتبہ بیت الخلاء بھی تو جاتے ہیں، چنانچہ انہوں نے خلیفہ کو یہ جواب لکھ دیا کہ مجھے معلم الصبیان کا عہدہ منظور نہیں ہے البتہ ایک وقت کی سرکاری دعوت منظور ہے؛ چنانچہ خلیفہ نے دعوت کے انتظامات کا حکم دے دیا، بڑے اعلیٰ پیمانہ پر انتظامات ہوئے، اور لکھا ہے کہ جس وقت قاضی شریح دعوت کھا کر باہر نکلے تو خلیفہ نے داروغہ مطبخ سے پوچھا کہ کہو، کھانا کیسا پکایا؟ اس نے چپکے سے خلیفہ کے کان میں یہ بات کہی کہ آپ بے فکر رہئے؛ میں نے کھانا ایسا پکایا ہے کہ وہ بچ کر نہیں جاسکتے۔ یہ لکھا ہے کہ جب انہوں نے دعوت کھالی تو پتہ نہیں اس دعوت کے اندر کیا ملا دیا گیا تھا کہ آگے چل کر " معلم الصبیان " کا عہدہ بھی قبول کرلیا۔

اب وہ خلیفہ کے بچوں کو پڑھانے کیلئے اس کے گھر جانے لگے، ایک مرتبہ خلیفہ نے انکو ایک پرچہ لکھ کر دیا جسکو آپ "ہنڈی" کہئے یا چیک (CHEQUE) کہئے دراصل اس زمانے میں بینکنگ (BANKING) کے یہ طریقے رائج نہیں تھے، جو آجکل ہیں، اس زمانہ میں نیشنل بینک (NATIONAL BANK) کی ایک بلڈنگ (BUILDING) ہوتی ہے، آپ وہاں چیک (CHEQUE) لیکر جاتے ہیں کہ صاحب! یہ سرکاری چیک ہے اسے بھنا دیجئے!

اُس زمانے میں یہ طریقہ ہوتا تھا کہ علاقے تقسیم ہوجاتے تھے اور کسی بڑے دولت مند کو اسکا ٹھیکیدار بنا دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات ان میں یہودی بھی ہوتے تھے۔ ان ٹھیکیداروں کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے اپنے علاقے سے وصولیابی بھی کرتے تھے اور اخراجات بھی کرتے تھے اور حساب وکتاب بھی رکھتے تھے۔ اور جب کبھی خلیفہ کوئی پرچہ لکھ کر کسی کو بھیجتا تو اسے بھی دے دیا کرتے تھے۔

تو خلیفہ نے قاضی شریح کو ایک پرچہ لکھ کر دیا جس میں یہ لکھا تھا کہ قاضی شریح کو ہمارے طرف سے دس ہزار درہم دے دیا جائے۔ قاضی شریح کہتے ہیں کہ جب میں پرچہ لیکر گیا تو پتہ چلا کہ جس آدمی کے نام پرچہ لکھا تھا وہ یہودی ہے۔ جب اس نے پرچہ پڑھا تو پھر وہ میری شکل کو دیکھتا تھا اور پرچہ کو دیکھتا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ کہنے لگا۔

"هَل بعتَ خزًا"

ارے! اتنی بڑی رقم لکھوا کر لایا ہے۔ سچ سچ بتانا۔ کیا تو نے ریشم بیچا تھا؟ کس چیز کی ہے اتنی بڑی قیمت؟ قاضی شریح کہتے ہیں کہ مجھے بڑی شرم آئی۔ میں نے اسکو یہ جواب دیا کہ جناب! ریشم نہیں بیچا تھا۔ ریشم سے زیادہ قیمتی چیز اپنا دین اور ایمان بیچا تھا جسکی قیمت میں وصول کرنے آیا ہوں۔

ہر دور میں علمائے حق نے دین کی پاسبانی کی ہے میرے دوستو! ہر دور میں ایسے لوگ رہے ہیں جنکا کام علماء کو اغواء کرکے اپنا مقصد پورا کرنا ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود ہر زمانہ میں اللہ کے ایسے بندے بھی رہے ہیں جو دین کی حفاظت کی خاطر خلیفۂ وقت سے ٹکر لینے سے بھی گریز نہیں تھے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو پھنسانے کیلئے ہر قسم کے جال ان کے اوپر ڈال دیئے گئے۔ ان کو بہکانے کیلئے طرح طرح کی کوششیں کی گئیں لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ حق کے اوپر قائم رہے اور حق بات کہتے رہے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی وجہ سے ہزاروں علماء کو بھی جو انہی کے پیچھے پیچھے ہوتے تھے کہ ابو حنیفہ

جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ حق ہے عتاب کا نشانہ بنایا گیا۔ انہیں تکلیفیں دی گئیں۔

امام ابو حنیفہؒ کی جرات ایک مرتبہ خلیفۂ وقت نے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ یہ ایک دستاویز ہے۔ اس کے اوپر آپ دستخط کردیں۔ یہ اس کے خاندان کی دستاویز تھی جس میں کوئی چیز خریدی یا بیچی گئی تھی، حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے پڑھا اور پڑھنے کے بعد یہ کہا کہ میرے دستخط کرنے کے معنی ہیں "شہادت دینا" اور شہادت تو میں صرف اسی چیز کی دے سکتا ہوں جو میرے سامنے ہوئی ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ کس نے کس کو کونسی چیز دی ہے؟ یہ واقعہ ہوا ہے یا نہیں ہوا ہے؟ آپ یہ دستاویز لیکر میرے پاس آئے ہیں تو میں کیسے دستخط کردوں جبکہ یہ واقعہ میرے سامنے نہیں ہوا ہے۔

خلیفہ بڑا ناراض ہوا اور یہ کہا کہ اتنے علماء جو اس دستاویز پر دستخط کئے ہیں کیا وہ عالم نہیں ہیں؟ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے کیسے دستخط کردیئے، بلایئے انہیں! چنانچہ علماء کی ایک بڑی تعداد آئی اور امام ابو حنیفہؒ کی موجودگی میں ان سے پوچھا گیا، اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے دستخط سے متعلق اپنا نقطۂ نظر انہیں بتلایا تو وہ لوگ جواب میں یہ کہنے لگے کہ ابو حنیفہؒ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ صحیح کہہ رہے ہیں، ہم نے تو خلیفہ سے ڈر کر دستخط کردیئے ہیں۔

یہود کے علماء ضمیر فروش تھے تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ احبارِ یہود میں سے تھے، یہود کے ایک بڑے زبردست عالم تھے، یہود قوم کے پاس علم بھی تھا اور علماء بھی بڑی تعداد میں تھے مگر چونکہ وہ ضمیر فروشی کیا کرتے تھے، دین فروشی کیا کرتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا کہ یہ خدا کے غضب کا مستحق ہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ جان بوجھ کر اور دیدہ ودانستہ اپنے مفاد کے خاطر خدا کے احکام کو خود بھی چھوڑتے تھے اور دوسروں سے بھی چھپاتے تھے۔

عبد اللہ بن سلامؓ کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ جب حضور اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو بھی پتہ چلا کہ مکہ میں ایک نبی اور پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں، تو آپ کے حالات سنتے رہے اور اپنی کتاب تورات میں اسکو دیکھ کر پرکھتے رہے کہ آنے والے نبی کی کیا کیا نشانیاں اور کیا کیا علامات ہیں، پھر جب حضور ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لا رہے تھے تو حضرت عبد اللہ بن سلامؓ نے دیکھا کہ لوگ جوق در جوق مدینہ سے باہر استقبال کیلئے جا رہے ہیں، وہ بھی حضورؐ کے استقبال کیلئے مدینہ سے باہر چلے گئے اور یہ سوچ کر ایک درخت کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گئے کہ جب حضور اکرم ﷺ تشریف لائیں تو سب سے پہلے میری نظر ان پر پڑے۔ حضور اکرم ﷺ جس راستہ سے مدینہ میں داخل ہونے والے تھے وہ ایک گھاٹی تھا۔ گھاٹی کا مطلب یہ ہے کہ راستہ ادھر نشیب میں تھا اور نشیب سے چڑھ کر پھر مدینہ میں داخل ہونے والے تھے۔

ﷺ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ درخت کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گئے اور جیسے ہی دور سے حضور اکرم ﷺ کو دیکھا تو کہنے لگے کہ خدا کی قسم یہ چہرہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ یہ اللہ کے نبی اور اللہ کے پیغمبر ہیں لہذا میں ان کے اوپر ایمان لاتا ہوں (۱) جسکا مطلب یہ ہے کہ یہود کے علماء کے پاس صحیح علم موجود تھا اور نصاریٰ کے پاس نہ صحیح علم تھا اور نہ علماء تھے۔

ماہ محرم سے سال کی ابتداء مدینہ کے اندر سنہ گیارہ نبوی میں دینِ اسلام پہنچ چکا ہے اور ہجرت سے پہلے ہی بہت سے لوگ مدینہ میں اسلام قبول کر چکے تھے، اس کے بعد سنہ ۱۳ نبوی میں ہجرت کا واقعہ ۱۲ ربیع الاول کو پیش آیا، بعض علماء نے لکھا ہے کہ دراصل محرم کی پہلی تاریخ سے ہی اکا دُکا صحابہؓ کا مدینہ جانا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ جب یہ طے ہو گیا کہ اسلامی تاریخ کا مبداء واقعہ ہجرت کو بنایا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوا

(۱) بخاری شریف باب مناقب عبد اللہ بن سلام /۳۶۲۱۔ مسند احمد /۱۲،۲۸

کہ ہجرت کا واقعہ چونکہ ربیع الاول کی ۱۲ تاریخ کو پیش آیا ہے لہٰذا ہمارا سال اسی تاریخ سے شروع ہونا چاہئے اور ۱۱ ربیع الاول کو ختم ہونا چاہئے۔ حضرت عمر فاروق نے فرمایا کہ ہمیں مبداء تاریخ تو ہجرت کے واقعہ کو ہی بنانا ہے البتہ سال کی ابتداء محرم کی پہلی تاریخ سے ہی کریں گے اس لئے عرب کے اندر قمری دور اسی طرح چلا آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہینوں کے بھی وہی نام رکھے گئے جو اہلِ عرب پہلے سے استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔

قمری سال کی بقا واجب ہے

اس لئے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمادیا تھا کہ تمہاری عبادتیں قمری اور چاند کے حساب سے وابستہ کردی گئیں ہیں۔ اسی لئے علماء نے لکھا ہے۔ "تفسیر بیان القرآن اٹھا کر دیکھ لیجئے" کہ چاند کی تاریخ کا نظام باقی رکھنا ہر مسلمان کے ذمہ واجب ہے۔ اور واجب اس لئے ہے کہ ہمارے دین کی بہت سی عبادتیں قمری اور چاند کی تاریخ سے متعلق ہیں۔

مثلاً کسی کا شوہر مرجائے تو اس کی عدت چار مہینے دس دن ہیں۔ یہ چار مہینے کونسے ہیں؟ چاند کے ہیں! اسی طرح اگر کوئی اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو اس کی عدت تین مہینے ہیں۔ یہ تین مہینے کون سے ہیں؟ چاند کے ہیں! اور فرمایا کہ ان احکام کے اندر اتنی باریکی ہے کہ اگر کسی عورت نے دو مہینے ۲۹ دن عدت طلاق گذارلی۔ اور ۲۹ ویں تاریخ کو چاند نہیں ہوا اور ۳۰ ویں تاریخ کو اس نے نکاح کرلیا تو فقہاء فرماتے ہیں کہ اس عورت کا نکاح جائز نہیں ہوا۔ اس لئے کہ اس کی عدت پورے تین مہینے میں جاکر ختم ہوتی تھی لیکن اس نے آخری دن نہیں گذارا اور چونکہ آخری دن پورا کئے بغیر اس نے نکاح کرلیا لہٰذا اسکا نکاح صحیح نہیں ہوا۔ بہرحال! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چونکہ ہماری بہت سی عبادتیں عرب میں رائج قمری دور اور چاند کے نظام سے متعلق کردی گئی ہے لہٰذا ہم چاند کا وہی نظام لیتے ہیں جو اسلام سے پہلے ہی عربوں کے درمیان رائج تھا۔ اور اس نظام میں سال کی ابتداء محرم الحرام سے ہوتی تھی لہٰذا ہمارے اسلامی سال کی ابتداء بھی

محرم الحرام کے پہلی تاریخ سے ہی ہوگی اور رہی دو مہینے گیارہ دن کی مدت، تو اس کسر کو نکال دیا جائے۔

ماہ محرم اور واقعہ ہجرت میرے دوستو اور بزرگو: جب محرم الحرام کا مہینہ آتا ہے تو وہ مہینہ ہجرت کے واقعہ کو یاد دلاتا ہے۔ اس لئے کہ تاریخ کا مقصد اور اسکا سب سے بڑا منشاء یہی ہوتا ہے کہ قوم کو یہ پتہ چلے کہ ہمارے بزرگوں نے اور ہمارے آباء واجداد نے کیا کیا کیا، اور جب قوم کو یہ پتہ چل جاتا ہے کہ انہوں نے اللہ کے دین کیلئے اپنے وطن کو چھوڑ دیا تھا، عزیز واقارب کو چھوڑ دیئے تھے تو ان کی رگوں میں جوش پیدا ہوتا ہے کہ ہم ان بزرگوں کی اولاد میں سے ہیں جنھوں نے اللہ کے دین کیلئے یہ کیا تھا۔ ان میں غیرت وحمیت پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ شانہ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو: اب تم مدینہ میں آگئے ہو اور اطمینان سے یہاں پر زندگی گذار رہے ہو، لیکن یہ بات یاد رکھنا کہ مکہ میں تم نے جو تکلیفیں اٹھائی ہیں اُن تکلیفوں کو کبھی نہ بھلانا۔ اس لئے کہ اگر تم نے ان تکلیفوں کو بھلادیا تو تمہارے اندر غیرت وحمیت باقی نہیں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مکہ کی تکلیفیں یاد دلاکر فرمارہے ہیں کہ "انہیں یاد رکھنا" یہ قوم کا سرمایہ ہے فرمایا کہ وَاذْكُرُوٓا اس کا ترجمہ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ یعنی "یاد کرو" فرمایا کہ۔

وَاذْكُرُوٓا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِى ٱلْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ ٱلنَّاسُ فَـَٔاوَىٰكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِۦ

اے مسلمانو: اس وقت کو یاد کرو جب تم مکہ کے اندر تھے، تمہاری تعداد بہت تھوڑی تھی مُّسْتَضْعَفُونَ فِى ٱلْأَرْضِ تم مکہ کے سرزمین میں کمزور تھے، تمہارے پاس طاقت نہیں تھی، تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ ٱلنَّاسُ اور ہر وقت تمہیں یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں جان پر نہ بن جائے فَـَٔاوَىٰكُمْ اللہ نے تمہیں ایک ٹھکانہ دے دیا۔ یعنی تم ہجرت

کرکے مدینہ آگئے اور تمہاری ساری تکلیفیں دور ہو گئیں۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ اب تمہیں جان کا خطرہ بھی نہیں ہے، ذلت وحقارت بھی اب تمہارے ساتھ وابستہ نہیں رہی بلکہ اب تمہاری عظمت وشوکت قائم ہوتی چلی جارہی ہے۔ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِۦ اور اللہ نے اپنی مدد اور نصرت سے تمہیں مضبوط بھی بنادیا۔ وَرَزَقَكُم مِّنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ اور اللہ تعالیٰ تمہیں کھانے کیلئے مالِ طیب یعنی مال حلال بھی عطا فرمایا ہے۔ اور جسکو مال طیب مل جائے اس کیلئے اس سے بڑی خوش قسمتی کچھ نہیں ہو سکتی بشرطیکہ مال طیب کے معنی بھی سمجھ لیجئے۔

حلال مال کی وضاحت مال طیب کا ایک ترجمہ ہے لذیذ لذیذ کھانا، عمدہ عمدہ کھانا اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو آزادی عطا فرماتے ہیں تو پھر اس کے نتیجہ میں قدرتی طور پر خوشحالی اور فراغت بھی مل جاتی ہے اور پہلے سے زیادہ بہتر قسم کے کھانے ملنے لگتے ہیں، اچھے قسم کے کپڑے پہننے لگتے ہیں، اچھے قسم کے مکان استعمال کرنے لگتے ہیں۔ مال طیب کا دوسرا ترجمہ ہے "حلال سے اونچا درجہ" مالِ حلال اس مال کو کہتے ہیں جسکو اللہ تعالیٰ نے جائز قرار دیا ہو اور قرآن وحدیث میں اسکی ممانعت نہ فرمائی ہو۔ جیسے آٹا، گندم، چنا، باجرا، ان چیزوں کی ممانعت نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں ہے، اس کو حلال کہتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کسی کے کھیت سے گندم چُرا کر لے آئے تو یہ گندم (فی نفسہ) حلال تو ہے لیکن مالِ طیب نہیں ہے، اس لئے کہ مال طیب اس مال کو کہتے ہیں جس مال سے کسی انسان کا حق وابستہ نہ ہو، اپنی جگہ پر گندم تو بے شک حلال ہے لیکن یہ کہ یہ مال طیب نہیں ہے اس لئے کہ دوسروں کے اوپر ظلم کرکے اور دوسروں کی حق تلفی کرکے تم نے اسے حاصل کیا ہے۔

تو اگر اللہ تعالیٰ کسی کو ایسا رزق عطا فرمادے کہ جو حلال بھی ہو اور اس سے کسی انسان کی حق تلفی بھی وابستہ نہ ہو، بغیر کسی کی حق تلفی کے اللہ تعالیٰ عطا

فرمادے تو اس سے بڑھ کر ایک مسلمان کیلئے کوئی دولت نہیں ہو سکتی۔ فرمایا کہ اے مسلمانو! تم مدینہ میں آگئے۔ تم کو مالِ حلال اور مال طیب بھی ملنے لگا۔ تمہاری جان کو بھی کوئی خطرہ نہیں ہے اور تمہاری عظمت وشوکت بھی اب قائم ہو گئی ہے۔ اس پر تم خدا کا شکر ادا کرتے رہو لیکن مکہ کے اندر جو تکلیفیں تم نے اٹھائی ہیں اسے نہ بھلانا۔ اس لئے کہ تم ان تکلیفوں کو جس قدر یاد رکھو گے اسی قدر تمہارے اندر جوش، حمیت اور غیرت پیدا ہو گی۔

تو میرے دوستو! کم از کم سال کے ابتداء میں ہجرت کا واقعہ یاد کر لیا کیجئے! کسی عاشق نے بالکل صحیح کہا ہے۔ فرمایا کہ ؂

تازہ خواہی داشتن گرد اغہائے سینہ را

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را

کبھی کبھی یہ پرانی داستان اور پرانی کہانی بھی اٹھا کر پڑھ لیا کرو۔ اس لئے کہ اس سے سینہ کے داغ ہرے ہو جاتے ہیں اور داغ ہرے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر دینی حمیت اور دینی جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہ قومی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا

اتباعہ وارنا الباطل وارزقنا اجتنابہ

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد

والہ واصحابہ اجمعین برحمتک

یاارحم الراحمین

والحمد للہ رب العلمین

شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ پہلے بڑے بڑے مجذوب، بڑے بڑے اللہ والے درویش پیدا ہوتے تھے، اب نظر نہیں آتے! کیا وجہ ہے؟ دراصل ایک وجہ تو یہی ہے کہ پیداوار کم ہے۔ اور پیداوار اس لئے کم ہے کہ آجکل اکثر و بیشتر لوگ حلال روزی نہیں کھاتے۔ خود پاکستان (PAKISTAN) میں رہنے والے ساڑھے سات کروڑ افراد اپنا اپنا جائزہ لیں، ان میں سے کتنے آدمی ایسے ہیں جو حلال روزی کھاتے ہیں؟ اور جن گھروں میں، جس ماحول میں حلال رزق میسر نہیں ہے تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس حرام روزی کو کھا کر شاہ ولی اللہؒ اور امام غزالیؒ پیدا ہو سکتے ہیں؟ کیا اس روزی کو کھا کر شاہ عبد القادر جیلانی اور خواجہ معین الدین اجمیری پیدا ہو سکتے ہیں؟ نہیں!

(ارشاد حضرت خطیب الامتؒ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

اَمَّا بَعْدُ. فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْإِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۚ وَمَنْ أَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۚ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١١١﴾
سُوْرَةُ التَّوْبَة

﴿ صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيْمُ وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ﴾

بزرگانِ محترم! ہماری اسلامی جنتری اور اسلامی کیلنڈر کے حساب سے یہ سال کا پہلا مہینہ ہے۔

اسلام سے قبل بھی مہینوں کے یہی نام تھے

اس مہینہ کو پہلا سال ختم ہو جاتا ہے۔ اور نئے سال کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کو آپ تقویم اور جنتری کہتے ہیں۔ اسی کو انگریزی میں کیلنڈر (CALENDAR) اور عربی میں سن کہتے ہیں، اسکا یہ پہلا مہینہ ہے۔ اس مہینہ سے صرف اسلامی سال ہی شروع نہیں ہوتا ہے، سال تو اسلام سے پہلے بھی اسی مہینہ سے شروع ہوتا تھا، چودہ سو سال پہلے بھی قمری حساب ذی الحجہ پر ختم ہو کر محرم الحرام سے ہی شروع ہوتا تھا۔ جب دنیا میں اسلام آیا تو اس نے اس نظام کو اپنایا ہے، اسلام نے یہ نظام قائم نہیں کیا۔ مہینوں کے یہ نام اسلام نے نہیں رکھے بلکہ اسلام

سے پہلے سے یہ رائج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب قرآن کریم نازل ہورہا ہے تو مہینوں کے وہی نام استعمال کررہا ہے۔ جو نزول قرآن سے پہلے لوگوں میں جاری وساری تھا۔ فرمایا کہ

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾

یعنی آپ لوگوں میں ایک مہینہ مشہور ہے، جسکو آپ رمضان کہتے ہیں۔ اسی مہینہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ رمضان کا نام پہلے ہی سے جاری تھا۔

ملّت مسلمہ کا آغاز اور اسکی انتہاء دونوں غم پر ہے تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ صرف یہی نہیں کہ محرم الحرام سے سن اور سال شروع ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے قمری سال بھی شروع ہوتا ہے، ہجرت کا سال بھی شروع ہوتا ہے، اور ہجرت کے سال سے میری مراد یہ ہے کہ آپ کو یہ کسی جشن، کسی خوشی اور کسی مسرّت کے واقعہ کی خبر نہیں دیتا بلکہ رنج وغم اور ایک اندوہناک واقعہ کے طرف آپ کا ذہن منتقل کرتا ہے اور بعض لوگوں نے جو یہ بات کہی ہے وہ بالکل صحیح کہی ہے کہ ملّت مسلمہ کا آغاز بھی غم سے ہے اور اسکی انتہاء بھی غم پر ہے، میرا اشارہ علامہ اقبال مرحوم کے اس شعر کی طرف ہے فرمایا کہ

غریب وسادہ ورنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اسکی حسین، ابتداء ہے اسماعیل

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی سے اسکی ابتداء ہوتی ہے اور انتہاءِ واقعہ اس امت میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قربانی اور شہادت کا واقعہ ہے۔ اسلئے اس دین کا مزاج عیش وطرب نہیں ہے، رنگ رلیاں نہیں ہے، اس دین کا مزاج ایسا ہے جیسا کسی متفکر اور پریشان کا مزاج ہوتا ہے۔

قرآن کی تاثیر فکر انگیز ہے طرب انگیز نہیں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے

اوصاف یہ بیان کئے جاتے ہیں کہ آپ ﷺ دائم الفکر تھے آپ ہمیشہ اس طریقے سے رہتے تھے جیسے کوئی آدمی غمگین ہوتا ہے جیسے کوئی آدمی متفکر اور پریشان ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہمارے نبی کی بھی یہ صفت ہے اور یہ کتاب (قرآن کریم) جس کے ذریعہ ہمیں اور آپ کو ہدایت ملی یہ بھی طرب انگیز نہیں ہے۔ فکر انگیز ہے۔ یعنی جس پر قرآن کریم کا اثر ہوتا ہے وہ خوشی میں رقص نہیں کرتا ہے۔ اس پر طرب نہیں آتی ہے بلکہ اس کا سر جھک جاتا ہے۔ تو قرآن کریم کی تاثیر فکر انگیز ہے طرب انگیز نہیں ہے۔ گانے، بجانے اور موسیقی سے آپ کے اندر جو جذبات پیدا ہوتے ہیں وہ عیش و طرب کے جذبات ہیں۔ اور جب آپ یہ سمجھیں کہ قرآن کریم کا اثر کسی پر ہوا ہے تو اس کے متعلق آپ یہ سمجھئے کہ جیسے ایک ہنستا ہوا آدمی غمزدہ بن جاتا ہے۔ یہ تاثیر ہے قرآن کریم کی۔ اور فطرت انسانی بھی غالباً ایسی ہی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ صحیح الفطرت انسان وہی ہے جسکی یہ کیفیت ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کبھی خوش نہ ہو یا نہ ہنسے، بلکہ خوش بھی ہو اور ہنسے بھی۔ لیکن کس طرح؟

سرکارِ دوعالم ﷺ دائم الفکر تھے حدیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ جب ہنستے تھے تو تبسم فرماتے تھے۔ آپ ﷺ نے تمام عمر کبھی قہقہہ نہیں لگایا، ہم اور آپ تو محفلوں میں اس طریقہ سے قہقہہ لگاتے اور ہنستے ہیں کہ جیسے اس سے چھت اڑ جائے یا دیواریں گر جائیں۔ حضور اکرم ﷺ تمام عمر قہقہہ لگا کر نہیں ہنسے۔ (۱) آپ ﷺ نے فرمایا کہ قہقہہ وہی لگا سکتا ہے جسکا دل آخرت سے بے فکر ہو۔ آپ ﷺ سے متعلق حدیث کے الفاظ مجھے یاد آگئے فرمایا کہ۔

كان متواصل الاحزان ودائم الفكرة (شمائل ترمذی / ص ۱۵)

متواصل کے معنی پے در پے، لگاتار کے ہیں، اور حزن کے معنی ہیں غم۔ یعنی

(۱) بخاری / ۵۶۲۷۔ مسلم / ۱۳۹۵۔ ترمذی / ۳۱۸۰۔ ابی داؤد / ۴۴۴۴۔ ابن ماجہ / ۳۸۸۱۔ مسند احمد ۲۳۸۳۲

ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا اور تیسرے کے بعد چوتھا غم جس طرح سے آتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح آپ پر پے در پے غم آرہا ہے" و دائم الفکرۃ.. (اور ہمیشہ آپ فکرمند رہتے تھے) اور جیسا کہ میں نے کہا صحیح فطرت بھی یہی ہے۔

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا پتلا مٹی سے تیار کیا تو انتالیس (۳۹) دنوں تک اس پتلے کے اوپر غموں کی بارش ہوئی ہے اور صرف ایک دن خوشی کی بارش ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی زندگی کا بیشتر حصہ آہ آہ کرتے ہوئے گذرجاتا ہے۔ اور ہنستے ہوئے صرف تھوڑا سا حصہ ہی زندگی کا گذرتا ہے۔

شہادت سے اسلامی تاریخ لبریز ہے میں نے یہ بات اس لئے عرض کی کہ صرف محرم کا مہینہ ہی نہیں، اسلام کی پوری تاریخ حادثات، غموں کے واقعات اور شہادتوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کی کسی قوم اور کسی ملت کے اندر شہید ہونے والوں کی اتنی بڑی تعداد آپ کو نہیں ملے گی جتنی بڑی تعداد آپ کو امت محمدیہ اور ملت اسلامیہ میں ملے گی۔

اور پھر شہیدوں کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ ایک شہید تو وہ ہے کہ راہ خدا میں جان دینی ہے اس لئے دل پکا کر کے بیٹھ گئے کہ لو بھائی میری گردن اڑا دو! اور شہید کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ کسی کو زبردستی گھیر کر مار دیا جائے۔ لیکن ایسے شہداء کی مثالیں جو موت سے پیار کرنے والے ہیں آپ کو اسلام کے سوا کسی مذہب میں نہیں ملیں گی۔ اکبر الہ آبادی مرحوم نے بالکل سچ کہا، فرمایا کہ

وہ کم ہیں تڑپنے میں جنہیں ملتی ہے لذت
یوں آپ کی شمشیر کے بسمل تو بہت ہیں (کلیات اکبر ج ۲ ص ۴۳)

جان دینے والے تو بہت ہیں لیکن ایسے جان دینے والے کتنے ہیں جو تڑپنے میں مزہ اور لذت محسوس کرتے ہیں ؟

صحابی رسولؐ کا ارمانِ شہادت

غزوہ احد میں دو صحابی نے آپس میں یہ طے کیا کہ چونکہ ابھی جہاد شروع نہیں ہوا ہے اس لئے آؤ بیٹھیں اور وقت ضائع نہ کریں۔ جہاد شروع ہونے سے پہلے ہم تم دونوں دعا کریں۔ تم دعا کرو میں آمین کہوں گا اور پھر میں دعا کروں گا تم آمین کہنا۔ اور دعا کرنے والے اور آمین کہنے والے دونوں کو قرآن دعا کرنے والا کہتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کررہے ہیں اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہہ رہے ہیں۔ تو دعا کرنے والے ایک ہیں اور آمین کہنے والے دوسرے۔ مگر قرآن کریم کہتا ہے۔ فرمایا کہ

قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا

تم دونوں کی دعا اللہ نے قبول کرلی ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن کی نظر میں دعا کرنے والا اور آمین کہنے والا دونوں دعا مانگنے والے ہیں۔

تو صحابی نے کہا، میں دعا مانگتا ہوں تم آمین کہو پھر تم دعا مانگو میں آمین کہوں گا۔ کہا، بہت اچھا! وہ دعا کرنے لگے فرمایا کہ "اے اللہ! اس جہاد کے اندر میرا مقابلہ کسی بہت بڑے طاقتور کافر سے ہو، دوسرے نے کہا، آمین اور دیر تک مقابلہ ہو اور ایسا ہو ویسا ہو پھر میں اس کے سینہ پرچڑھ کر اس کو قتل کر ڈالوں۔ یہ سب دعا مانگ رہے ہیں اور دوسرے آمین، آمین کہہ رہے ہیں۔

جب ان کی دعا ختم ہوچکی تو دوسرے نے کہا بھائی! تم نے دعا مانگی میں نے آمین کہی، اب میں دعا مانگتا ہوں تم آمین کہو، میں نے ابھی کہا تھا نا! کہ ایسے جانبازوں اور سرپھروں کی مثال نہیں ملے گی۔ اکبر کے اس شعر میں بڑی نورانیت ہے۔ فرمایا کہ"

وہ کم ہیں تڑپنے میں جنہیں ملتی ہے لذت　　یوں آپ کی شمشیر کے بسمل تو بہت ہیں

میری ناک کاٹ دی جائے

انہوں نے کہا، اچھا صاحب! اب آپ دعا کرو۔ انہوں نے یہ دعا کی کہ اے اللہ! اس جہاد میں میرا مقابلہ کسی بہت بڑے طاقتور کافر سے ہو اور دیر تک مقابلہ ہو اور یہ ہو اور وہ ہو۔ پھر آخر میں کہتے ہیں کہ پھر میں اس کے ہاتھوں شہید کر دیا جاؤں۔ اور جب میں شہید کر دیا جاؤں تو میرا ہاتھ کہیں پڑا ہو، میرے بدن کے ٹکڑے کہیں پڑے ہوں، میری ناک کاٹ دی جائے، میرے کان کاٹ دیئے جائیں اور میری آنکھیں نکال لی جائیں، مجھے مثلہ کر دیا جائے۔ دوسرے صحابی آمین، آمین کہہ رہے ہیں، پھر انہوں نے کہا کہ اسی حالت میں مجھے اللہ کے دربار میں پیش کیا جائے اور اللہ تعالیٰ پوچھے کہ ہم نے تجھے آنکھ، ناک اور کان دے کر پیدا کیا تھا وہ کہاں ہیں؟ میں اللہ کے دربار میں کہوں کہ اے اللہ! تیری راہ میں کٹوا کر آیا ہوں! اب آپ ایمانداری سے بتایئے کہ ہے کسی مذہب وملت میں شہداء کی یہ شان؟ جان دینے میں بھی اپنا اپنا جداگانہ مذاق ہے۔ عربی کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

ومن دیدن حب الدیار لاهلها
وللناس فیما یعشقون مذاهب

عشق کے بہت سے مذاہب اور طریقے ہیں، ایک ہی طریقہ پر عشق کا اظہار نہیں ہوتا۔ دو طریقے تو ابھی میں نے آپ کو بتائے۔

حضور اکرم ﷺ کی تمنائے شہادت

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ

والذی نفسی بیده لوددت انی اقتل فی سبیل الله ثم احی ثم اقتل ثم احی ثم اقتل ثم احی ثم اقتل (۱)

آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میری تمنا اور میری خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر (لذت شہادت کی خاطر) مجھے دوبارہ زندہ کیا جائے پھر شہید کیا

(۱) بخاری / ۶۶۸۵۔ مسلم / ۳۴۸۴۔ سنن نسائی ۳۰۰۱۔ سنن ابن ماجہ / ۲۷۴۳۔ مسند احمد / ۱۰۳۲۳۔ موطا مالک / ۸۷۱۔ سنن دارمی / ۲۲۸۴

جائے، پھر زندہ کیا جائے پھر شہید کیا جائے، پھر زندہ کیا جائے، پھر شہید کردیا جائے۔

اب آپ نے اندازہ لگایا؟ سرکار دوعالم ﷺ نے اپنی امت کے اندر شہادت کا کیسا جذبہ پیدا کیا تھا؟ اسی لئے ملت اسلامیہ کی تاریخ شہادت کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

بلال عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے جیسے ہی محرم الحرام کا مہینہ آتا ہے، پہلی تاریخ کو ہی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ تازہ ہوجاتا ہے اور یہ واقعہ تو خیر، بعد کا واقعہ ہے بلکہ جس وقت آپ محرم کا چاند دیکھتے ہیں۔ چاند بھی آپ سے باتیں کرتا ہے بعضے اس کو سمجھتے ہیں اور بعضے نہیں سمجھتے! کسی عاشق نے کہا جو سمجھتا تھا ؎

پیامِ عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے بلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

عید کا چاند کہہ رہا ہے، اے دیکھنے والو! تمہیں خوشی مبارک ہو۔ عاشق کہتا ہے کہ تو پیام عیش و مسرت دیتا ہے لیکن ہم جیسے دل جلوں کا دل دکھا رہا ہے۔

محرم الحرام کا چاند آپ سے کیا کہتا ہے؟ جب محرم کا چاند نکلتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ اے مسلمانو! اس واقعہ کو یاد کرو جب سرکار دوعالم ﷺ مکہ مکرمہ سے ہجرت فرماکر مدینہ منورہ تشریف لے گئے، کیونکہ ہمارا سال ہجری ہے، ہمارا سنہ ہجری ہے میلادی یا وفاتی نہیں ہے۔ وفاتی سنہ وہ کہلاتا ہے کہ جس میں کسی شخصیت کی وفات کی یاد دلائی جائے اور میلادی سال وہ ہوتا ہے جو کسی شخصیت کی ولادت کی یاد تازہ کرے جیسے کہ سنہ عیسوی، جس کی بنیاد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت پر ہے وفات پر نہیں ہے، کیونکہ ابھی تک آپ علیہ السلام کی وفات نہیں ہوئی ہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پاگئے۔ حیرت ہے! قرآن کریم کہتا ہے، کسی مسلمان کو یہ عقیدہ نہیں رکھنا چاہئے۔

فرمایا کہ۔ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا گیا۔ ان کو پھانسی پر نہیں چڑھایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمان پر اٹھا لیا۔ تو یہ سنہ عیسوی سنہ ہجری نہیں بلکہ میلادی ہے۔ لیکن ہم اور آپ کیسے ذوق و شوق سے سنہ عیسوی لکھتے ہیں۔ میں آپ سے یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ یہ سنہ لکھنا ناجائز ہے لیکن میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اتنا شوق ہمیں سنہ ہجری لکھنے کا نہیں ہے کہ جس سے ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد تازہ ہوتی ہے جتنا کہ سنہ عیسوی لکھنے کا شوق اور رواج ہے۔

تو ہمارا سنہ میلادی نہیں ہے۔ وفاتی نہیں ہے اور جلوسی ہونے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ کیونکہ سنہ جلوس تو وہ سنہ کہلاتا ہے کہ جس سے کسی بادشاہ کی تخت نشینی کی یاد تازہ ہو۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بادشاہ نہیں تھے

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بادشاہ نہیں تھے کہ آپ کی تخت نشینی ہوئی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا آپ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح بادشاہت چاہتے ہیں یا نبوت؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے بادشاہت و سلطنت نہیں چاہئے! مجھے صرف اللہ کی عبدیت اور اسکی بندگی چاہئے۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مہینہ جب شروع ہوتا ہے اور چاند نکلتا ہے تو وہ آپ سے یہ کہتا ہے ؂

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ ء پارینہ را

یعنی اے مسلمانو! اگر تم اپنی تاریخ کو، اپنے بزرگوں اور اپنے اسلاف کی قربانیوں کو یاد رکھنا چاہتے ہو تو ہجرت کا واقعہ یاد رکھو، یہ کہتا ہے چاند!

سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت

پھر صبح ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ کیونکہ ۲۶ ذی الحجہ کو آپ پر حملہ ہوا اور غالباً پہلی یا

دوسری محرم کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی ہے۔ اور یہ شہادت ہے۔ کیونکہ اسی حملہ کی وجہ سے آپ شہید ہوئے۔ کیوں کیا حملہ؟ اس لئے کہ آپ کی ساڑھے دس سالہ دور حکومت وخلافت کا باب تاریخ اسلام کا سب سے زیادہ سنہرا باب ہے جو قیامت تک کے لئے مسلمانوں کی تاریخ کو روشن کرتا رہے گا۔ اور پھر ایک دو نہیں ۔ بہت سی شہادتیں ہیں۔ (۱)

ہجرت کے ساٹھ سال بعد ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تقریباً ساٹھ سال گذر جانے کے بعد جب اکسٹھواں محرم آیا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، اور یہ سانحہ بھی ایسا ہے کہ اس کو گذرے ہوئے تقریباً تیرہ سو چالیس (۱۳۴۰) سال کا عرصہ ہو گیا لیکن آج بھی یہ واقعہ ایسا ہی تازہ نظر آتا ہے جیسا کہ یہ واقعہ آج ہی پیش آیا ہے۔ ابھی تک مسلمانوں کے دلوں میں غم کا یہ واقعہ تازہ ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ آج اسی سانحہ پر کچھ روشنی ڈالی جائے اگرچہ مختصر سی محفل میں اس واقعہ پر روشنی ڈالنا اور اس واقعہ کو بیان کرنا دشواری پیدا کر سکتا ہے۔

میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ بعض واقعات ایسے پیچیدہ قسم کے ہوتے ہیں کہ اگر انہیں اجمالی طور پر بیان کردیا جائے تو اگرچہ بیان کرنے والے اور سننے والے دونوں کو ثواب ہوگا۔ لیکن اس کی وجہ سے دماغوں میں بعض الجھنیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ کیونکہ یہ زندگی کا تجربہ ہے کہ جب تک کسی واقعہ کی تفصیل بیان نہ کی جائے انسان کا ذہن کسی اور طرف جاتا ہے اور جب اسی واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کردیا جائے تو ذہن پھر دوسری طرف جاتا ہے۔ یہ ایک دفعہ کا نہیں، لاکھوں دفعہ کا تجربہ ہے۔

ہمارے حدیث کے اساتذہ میں سے حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ علیہ بڑے محدث بھی تھے اور بڑے اللہ والے بزرگ بھی تھے۔ ان کے سب سے زیادہ

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۱/ ۲۹۱

معتقد راندیر (RANDHER) اور (SURAT) سورت کے لوگ تھے، چنانچہ ان کا مزار بھی راندیر میں ہی ہے، بہت ہی کم سخن تھے اور انتہائی حکیمانہ باتیں کرتے تھے۔ اگر کوئی بات کسی کے سمجھ میں نہ آتی تھی تو فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! یہ بات ذوقی ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ بڑے سے بڑا عقل والا اس کو سمجھ لے اسکو سمجھنے کیلئے ذوقِ سلیم ہونا چاہیئے۔ تو فرمایا کرتے تھے کہ یہ بات ذوقی ہے اور ذوق مرگیا دلی میں۔ مطلب یہ ہے کہ ذوق اب کہاں ہے؟ تمہارے اندر بھی ذوق نہیں ہے اس لئے تم سمجھ نہیں سکتے۔

واقعات کی نزاکت اکثر درس میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی صاحب! بعض واقعات ایسے ہیں کہ اگر مختصر طور پر کہے جاتے ہیں تو آدمی کا ذہن کسی اور طرف جاتا ہے اور جب تفصیل سے بتائے جاتے ہیں تو ذہن دوسری طرف جاتا ہے۔ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں، ان کے پاس ملک کے طول و عرض سے لوگ تعویذ گنڈوں کیلئے بھی آیا کرتے تھے مگر چونکہ وہ بڑے محدث تھے اس لئے وقت اس میں ضائع نہیں کرتے تھے فرماتے تھے کہ ان لوگوں کے آنے کی وجہ سے میرے مطالعہ میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ میرے پڑھانے میں خلل پیدا ہوتا ہے لہٰذا ان کیلئے وقت مقرر کردیا تھا۔ چھوٹے سے چھوٹا، بڑے سے بڑا آدمی اگر تعویذ لینے کیلئے آتا تو کہتے کہ عصر کے بعد آؤ اور بس! باقی میرا وقت درس و تدریس، پڑھنے اور مطالعہ کرنے کا ہے۔

زیارت کیلئے آیا ہوں ایک صاحب کہیں باہر سے آئے اور انہوں نے دروازے کی کُنڈی بجائی۔ حضرت میاں صاحب کنڈی لگا کر اندر مطالعہ کررہے تھے جب انہوں نے کنڈی بجائی تو دروازہ کے قریب آکر پوچھا، بھائی کون؟ ہم اور آپ تکلّف کی زبان بولتے ہیں اور ہمیں یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ اس تکلّف کی زبان میں ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ حضرتؒ نے پوچھا، تم کون ہو؟ انہوں نے کہا، جی! میرا نام فلاں ہے۔ پوچھا،

کہاں سے آئے ہو؟ کہا، سیالکوٹ سے! پھر پوچھا، کیسے آئے؟ انہوں نے کہا، جی! زیارت کیلئے آیا ہوں۔ حضرت میاں صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ ایک مسلمان مجھ سے عقیدت رکھ کر اتنی دور کا سفر طے کر کے آیا ہے تو اس کے قدم بھی ہمارے لئے باعثِ رحمت ہیں، ہو سکتا ہے کہ اس شخص کی اس عقیدت کی وجہ سے ہی اللہ ہمیں بخش دے... حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد ہے، فرمایا کرتے تھے کہ جو لوگ مجھے نیک سمجھ کر مجھ سے ملنے کیلئے آتے ہیں، میں ان کے آنے کو اپنے لئے سرمایۂ نجات سمجھتا ہوں، کیونکہ میں تو نیک نہیں ہوں لیکن اللہ کے بندے مجھے نیک سمجھ رہے ہیں۔

کان پکڑ کے باہر نکال دیا تو میاں صاحبؒ نے یہ سمجھ کر کہ ایک شخص صرف زیارت کیلئے آیا ہے فوراً کنڈی کھول دی۔ اور فرمایا کہ آؤ بھائی آؤ! فرمایا کہ سب اپنی اپنی غرض اور اپنے اپنے کام کو ہی آتے ہیں، چلو! اللہ کا ایک بندہ تو صرف ملاقات کیلئے آیا ہے، یہ اللہ کا کتنا نیک بندہ ہے جو صرف ملاقات کیلئے آیا ہے... میاں صاحبؒ فرمانے لگے کہ میں نے اسے پنکھا دنکھا بھی جھلا، اس لئے کہ مہمان کی خدمت کرنی چاہئے اس کی وجہ سے اس نے یہ سمجھ کر کہ ہم نے تو اس مولوی صاحب کو بوتل میں اتار ہی لیا، فوراً کہنے لگا، حضرت جی! ایک تعویذ لینا ہے۔ فرمایا" لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ"

میاں صاحبؒ کو غصہ آگیا، پنکھا رکھا اور کان پکڑ کے دروازے کے باہر نکال کر کہا کہ جاؤ عصر کے بعد آنا اور کنڈی لگالی۔

یہ کیسے محدث ہیں؟ حضرت میاں صاحبؒ فرماتے تھے کہ اب یہ آدمی جو یہاں سے گیا اور لوگوں سے جا کر یہ واقعہ بیان کرنے لگا تو جن لوگوں کے سامنے یہ مختصر طور پر بیان کرتا، سب مجھے بُرا بھلا کہتے کہ یہ کیسے عالم ہیں؟ یہ کیسے محدث ہیں؟ یہ کیسے نائب رسول ہیں؟ وغیرہ۔ وہ صرف دو لفظوں میں واقعہ بیان کرتا تھا کہ میں میاں صاحبؒ کے

یہاں گیا، میاں صاحبؒ نے مجھے گھر سے باہر نکال دیا اور کنڈی لگالی۔ بس! اور فرمایا کہ جو آدمی مجھ سے پوچھتا تھا اور میں اس سے کہتا تھا کہ میں نے تعویذ گنڈے کیلئے عصر کے بعد کا وقت رکھا ہے، باقی وقت میرا درس وتدریس کا ہے، یہ آدمی آیا اور یہ جھوٹ بولا کہ میں آپ کی زیارت کیلئے آیا ہوں، لہذا میں نے اسے اندر بلالیا، لیکن جب مجھے یہ پتہ چلا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے تو میں نے اسکو نکال دیا اور کہا کہ تم عصر کے بعد آنا۔ تو جب میں یہ بات تفصیل سے سناتا تو پھر لوگ میری حمایت میں باتیں کرنے لگتے تھے۔ اندازہ لگایا آپ نے؟ مختصر کہئے تو کسی اور نتیجہ پر اور وضاحت سے تو کہئے تو دوسرے نتیجہ پر۔

عقل پرستی اور انکار نبوّت شہادت حسین رضی اللہ عنہ میں بھی دراصل تاریخ کے بعض ایسے پیچیدہ قسم کے واقعات ہیں کہ اگر اسے ویسے ہی سرسری طور پر بیان کردیا جائے تو کبھی کبھی بعض الجھنیں بھی پیدا ہوسکتی ہیں، خاص طور سے اس زمانہ میں کیونکہ یہ زمانہ ایسا زمانہ ہے کہ نعوذ باللہ! نعوذ باللہ! اگر کسی سے کہا جائے۔ قال رسول اللہ۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے، تو آپ کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جو یہ کہیں گے کہ بیشک حضور ﷺ کا ارشاد سر آنکھوں پر ہے لیکن جب تک ہماری عقل میں نہ آجائے ہم ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ آج ایسے ایسے عقل پرست انسان بھی دنیا میں ملیں گے اور یہ عقل پرستی نہیں ہے، یہ نبوت کا انکار ہے۔

اور یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوبات میں لکھا ہے، اٹھا کر دیکھ لیجئے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی قول رسول کو سن کر یہ کہتا ہے کہ جب تک میری عقل میں نہیں آئے گا میں نہیں مانوں گا، فرمایا کہ وہ نبوت کا منکر ہے دراصل وہ اپنی عقل پر ایمان لایا ہے۔ نبی پر ایمان نہیں لایا ہے۔ تو اس زمانہ کے لوگ انتہائی بے باک اور گستاخ ہیں۔

غذا اور خوراک کے اثرات حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ پہلے بڑے بڑے مجذوب، بڑے بڑے اللہ والے درویش پیدا ہوتے تھے، اب نظر نہیں آتے! کیا وجہ ہے؟ دراصل ایک وجہ تو یہی ہے کہ پیداوار کم ہے۔ اور پیداوار اس لئے کم ہے کہ آجکل اکثر و بیشتر لوگ حلال روزی نہیں کھاتے، خود پاکستان (PAKISTAN) میں رہنے والے ساڑھے سات کروڑ افراد اپنا اپنا جائزہ لیں، ان میں سے کتنے آدمی ایسے ہیں جو حلال روزی کھاتے ہیں؟ اور جن گھروں میں، جس ماحول میں حلال رزق میسر نہیں ہے تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس حرام روزی کو کھا کر شاہ ولی اللہ اور امام غزالیؒ پیدا ہو سکتے ہیں؟ کیا اس روزی کو کھا کر شاہ عبد القادر جیلانی اور خواجہ معین الدین اجمیری پیدا ہو سکتے ہیں؟ نہیں۔

حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے دودھ کی برکت غذا اور خوراک کے اثرات انسان کے رگ و پے اور اس کے ضمیر پر پڑتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں حضور ﷺ سے ایک صحابی نے یہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اللہ نے آپ کو کیا جوش خطابت عطا فرمایا ہے! اللہ تعالیٰ نے آپ کو طاقتِ لسانی عطا فرمائی ہے، جوش بیان عطا فرمایا ہے۔ حالانکہ یہ کمال پیغمبرانہ کمال ہے، یہ کوئی رسول اللہ نے مشق یا پریکٹس (PRACTICE) کر کے نہیں سیکھا تھا۔ اسلئے کہ نبی کے کمالات کسبی نہیں ہوتے وہبی ہوتے ہیں، عطائے الٰہی ہوتے ہیں۔ مگر آپ ﷺ نے جواب میں کیا ارشاد فرمایا؟ آپ نے فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کس خاتون کا دودھ پیا ہے؟ میں نے خاندان بنو سعد کی ایک نیک خاتون کا دودھ پیا ہے۔ جسکا نام حلیمہ سعدیہ ہے۔ فرمایا کہ یہ اسی کی برکتیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ جب کسی بچہ کی پیٹ میں ماں کے دودھ کے قطرے جاتے ہیں، اگر ماں نیک ہوتی ہے تو اس قطرے کے ساتھ ساتھ نورِ ایمان بھی جاتا ہے اور اگر وہ بد ہے تو اسی قسم کے اثرات اس بچہ کے اندر جاتے ہیں۔

ڈبہ کا دودھ آجکل جو لوگ اہل کتاب عورتوں سے شادیاں کرتے ہیں یا بچوں کو دودھ پلانے کیلئے نرسیں (NURSES) رکھتے ہیں. کوئی جانوروں کا دودھ پلا رہا ہے تو کوئی ڈبہ کا دودھ پلا رہا ہے. اس کو پتہ بھی نہیں کہ وہ کس ملک سے آرہا ہے. ان لوگوں کو سوچنا اور یقین کرلینا چاہئے کہ ان کے بچوں پر اسی قسم کے اثرات پڑیں گے۔ بعض لوگ جو یہ سوچتے ہیں کہ ہماری نانی اماں یا ہماری دادی اماں تو تہجد گذار تھیں. لیکن ان کی کسی اولاد میں ان کی کوئی تاثیر نہیں ہے۔ ارے! تاثیر آئے کہاں سے؟! اگر کسی اہلِ کتاب عورت کا دودھ پیا ہے. اگر کسی نصرانیہ یا یہودیہ کا دودھ پیا ہے تو اثر تو اسی کا ہو گا۔

زیاد ابن ابیہ خیر! یہ بہت لمبا موضوع ہے. اس کو بیان کرنے کی اس وقت فرصت نہیں ہے. تاریخ میں ایسی بہت سی شخصیتیں ہیں جن کا نسب ٹھیک نہیں ہے اور جن کے نسب میں کھوٹ تھا ان کے کردار میں بھی کھوٹ ظاہر ہو کر رہا ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں بھی اسی قسم کی ایک شخصیت ہے جسکا نام نا معلوم باپ کے ساتھ لیا جاتا ہے. ہمیں نہیں معلوم کہ اسکا باپ کون ہے؟ تاریخ میں اس اسکا نام زیاد بن ابیہ لکھا جاتا ہے. زیاد بن ابیہ کا ترجمہ ہے "زیاد اپنے باپ کا بیٹا" لیکن باپ کون؟ یہ کوئی نہیں جانتا! اس لئے اگر چاہو تو اسکی نسبت ماں کے ساتھ کرلو۔ اور ایسا ہوا بھی ہے۔

حضرت عبد اللہ ابن ام مکتوم. یہ سرکار دوعالم ﷺ کے مؤذن ہیں. یہ عبد اللہ ابن ام مکتومؓ کہلاتے ہیں یعنی عبد اللہ. ام مکتوم کے بیٹے. وجہ اسکی یہ ہے کہ مکتوم کے معنی نابینا کے آتے ہیں۔ حضرت عبد اللہؓ نابینا تھے. اور سرکار دوعالم ﷺ کے مؤذن ہونے کی وجہ سے تمام گھرانوں میں ان کی والدہ کی بڑی عزت تھی. اور جب وہ کہیں جاتی تھیں تو لوگ کہتے تھے کہ مکتوم کی ماں آگئیں. نابینا کی ماں آگئیں. اسطرح ان

کی کنیت ام مکتوم پڑ گئی۔ اب یہ ام مکتوم سے اتنی مشہور ہوئیں اتنی مشہور ہوئیں کہ جب حضرت عبداللہؓ کا نام لیا جاتا ہے تو مجہول ماں کے ذریعہ سے لیا جاتا ہے۔

نسب میں کھوٹ تاریخ میں ایک شخصیت ایسی ہی ہے جسکا نام زیاد ابن ابیہ لکھا جاتا ہے۔ یعنی زیاد اپنے باپ کا بیٹا۔ لیکن باپ کون؟ یہ ابو سفیانؓ کا بیٹا ہے۔ دراصل زمانۂ جاہلیت میں نکاح کا ایک ایسا طریقہ رائج تھا جسکو ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا، وہ نکاح کے درجہ میں نہیں تھا، ابو سفیانؓ کا ایک خاتون سے نکاح کے اسی طریقہ کے ذریعہ ربط تھا، جس کے نتیجہ میں زیاد پیدا ہوا۔ لیکن ابو سفیان رضی اللہ عنہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ یہ میرا بیٹا ہے، انہوں نے کبھی زیاد کو اپنا بیٹا نہیں کہا۔ اس لئے اب کس باپ کے نام سے پکارا جائے؟ چنانچہ زیاد ابن ابیہ کے نام سے مشہور ہوا، معلوم ہوا کہ نسب میں کھوٹ ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کمال فراست ایک مرتبہ اس نے بڑی چالاکی کی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایک خط لکھا۔ اور خط لکھنے کا اسلامی طریقہ یہ ہے کہ پہلے "من فلان" فلاں آدمی کے جانب سے "الی فلان" فلاں آدمی کی طرف۔ لکھا جاتا ہے۔ تو اس نے لکھا من زیاد بن ابی سفیان الی ام المؤمنین عائشہ یعنی زیاد ابن ابی سفیان کی جانب سے ام المومنین عائشہ کی طرف۔ اور اس میں سیاست یہ تھی کہ چونکہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ ہیں اس لئے اگر انہوں نے میرے اس خط کے جواب میں یہ لکھ دیا کہ من عائشہ الی زیاد ابن ابی سفیان تو میرا باپ کنفرم (CONFORM) ہوجائے گا۔ اور یہ معلوم ہوجائے گا کہ انہوں نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ میرا باپ ابوسفیانؓ ہے۔

لیکن "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" خاندان نبوت میں اللہ تعالیٰ نے جو فراست عطا

فرمائی تھی وہ پوری کائنات میں کسی خاندان کو عطا نہیں فرمائی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں لکھا

"من ام المومنین عائشة الی زیاد ابن ابیه"۔

ام المؤمنین عائشہؓ کی طرف سے زیاد کی طرف یہ خط بھیجا جارہا ہے جو اپنے باپ کا بیٹا ہے۔ باپ کون؟ یہ میں نہیں جانتی۔

خاصان خدا کی ناقدری باعث عذاب ہے

بات بڑھ گئی! عرض میں یہ کررہا تھا کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں درویش کہاں گئے؟ مجذوب کہاں گئے؟ حضرت مولانا تھانویؒ نے فرمایا کہ ایک تو پیداوار کم ہے اور جو پیدا ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں خلقِ خدا کی نظروں سے چھپا کر رکھتے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لیجئے کہ کیوں چھپا کر رکھتے ہیں؟ اس لئے کہ آجکل عام مذاق بے ادبی اور گستاخی کا ہے، اگر ایسے خاصانِ خدا کے ساتھ بد تمیزی اور گستاخی کی گئی تو ہوسکتا ہے کہ اس گستاخی کی وجہ سے امت پر عذاب نازل ہو جائے، اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے خواص اور مقبول بندوں کو چھپا کر رکھتا ہے۔

خیر! عرض میں یہ کررہا تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ اگر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے تو زیادہ مناسب ہے لیکن اس ایک نشست میں یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے میں صرف انکی شہادت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے واقعہ کا مختصر تذکرہ کرتا ہوں۔

سیرت حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جو ۶۱ھ کے محرم کے عاشورہ یعنی دسویں تاریخ کو اپنے بہتّر جانثاروں کے ساتھ میدان کربلا میں شہید ہوئے۔ انہوں نے خاک و خون میں تڑپ کر اپنی قربانی دی، وہ ۴ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے تو اس وقت ہجرت کے

گیارہویں سال کے صرف دوماہ گذرے تھے جسکا مطلب یہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں اس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عمر تقریباً سات سال تھی ۱۱اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ ان سے ایک سال کے بڑے تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی کنیت "ابو محمد" اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کنیت "ابو عبد الله" ہے اور ان کا لقب کیا ہے؟ سبحان اللہ! ان دونوں کا لقب "ریحانته النبی" ہے۔ ریحانہ کے معنی خوشبو کے ہیں۔ یعنی سرکار دوعالم ﷺ کیلئے یہ دونوں ایسے ہیں جیسے کہ بہترین خوشبو۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا ایک لقب "شبیه رسول الله"(۱) بھی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں صاحبزادے سرکار دوعالم ﷺ سے مشابہت رکھتے تھے۔ البتہ علماء نے یہ فرق کیا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے اندر اخلاق وعادات کے اعتبار سے مشابہت زیادہ تھی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اندر بدن اور جسم کے اعتبار سے مشابہت زیادہ تھی۔ یہ دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادے اور حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کے چشم وچراغ ہیں، اور سرکار دوعالم ﷺ کے نواسے اور نورِ نظر ہیں۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ منبر پر خطبہ دے رہے تھے، یہ دونوں جیسا کہ میں نے بتایا چھوٹے تھے، چار پانچ سال کے ہوں گے، یہ دونوں وہاں کے رواج کے مطابق لمبے لمبے کُرتے پہنے ہوئے مسجد میں تشریف لا رہے ہیں، سرکار دوعالم ﷺ کی محبت کا یہ عالم ہے کہ آپ نے منبر سے اتر کر انہیں گود میں اٹھا لیا کہ کہیں یہ اپنے لباس میں الجھ کر گر نہ جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ محبت فطری ہے، ہر صاحب اولاد کو اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے لیکن اولاد کی اولاد سے جو محبت ہوتی ہے، وہ اہم ہے۔

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما عہد فاروقی میں | حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما

(۱) تهذیب التهذیب ج ۲ / ۲۵۰، صفۃ الصفوۃ ج ۱ / ۵۹۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں نو عمر تھے لیکن حضرت عمر فاروق ؓ کے دور خلافت میں بلوغ کی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ حضرت عمر فاروق ؓ ان دونوں سے اپنی اولاد سے بھی زیادہ محبت کرتے تھے۔ انکا احترام کرتے تھے۔ ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ یمن سے کچھ چادریں یا کہیے کہ جوڑے آئے۔ جو بڑے خوبصورت اور حسین تھے۔ آپ ؓ نے ان جوڑوں کو نو عمر بچوں میں تقسیم کروادیئے۔ تھوڑی دیر میں وہ بچے اپنے اپنے گھروں سے وہ جوڑے پہن کر آئے۔ مسجد نبوی سے متصل حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے گھر سے بھی یہ دونوں صاحبزادے آئے لیکن ان کے جسم پر وہ حلّہ (جوڑا) نہیں تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ بھائی! جن لوگوں کو یہ لباس اور حلّہ پہنایا گیا ہے انہیں دیکھ کر مجھے خوشی نہیں ہوئی اس لئے کہ جب یہ صاحبزادگان رسول ؐ کے بدن پر وہ حلّہ نہیں ہے تو مجھے کوئی خوشی نہیں ہے۔ آپ ؓ نے فرمایا کہ یمن سے پھر جوڑے منگائے جائیں۔ چنانچہ منگائے گئے پھر آپ نے ان کو پہنایا اور خوش ہوئے۔ حضرت عمر فاروق ؓ کے دور خلافت میں ان دونوں کا خاص اہتمام تھا۔ آپ ؓ ان کی عزت بھی بہت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق ؓ خطبہ دے رہے تھے۔ یہ دونوں مسجد میں تشریف لائے۔ ابھی ان کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی۔ جب یہ مسجد میں آئے تو آپ ؓ نے اپنے پاس ممبر پر بیٹھالیا۔

مراعات صد کن برائے یکے میرے بتانے کا مقصد یہ ہے کہ یہ دونوں حضرات صرف حضور اکرم ﷺ ہی کے چشم و چراغ نہیں تھے۔ بلکہ خلفائے راشدین کی نظروں میں بھی ان کا جو مقام و مرتبہ تھا، جو عزت احترام تھا اور جو محبت تھی وہ کسی کی نہیں تھی، یہ قدرتی بات ہے۔ محبت کا ایک اصول ہے۔ ع

مراعات صد کن برائے یکے

اگر ایک سے محبت ہے تو اس ایک کی محبت کی خاطر سو سے مراعات کرنی

پڑے گی۔ محبت کرنے والوں نے تو یہ بھی کر کے دکھا دیا کہ اگر لیلیٰ سے محبت ہے تو اس کے کتے سے بھی محبت کرتے ہیں۔ لیلیٰ جس مکان میں رہتی تھی اس مکان کے کھنڈرات، اسکی مٹی اور اینٹوں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مجنوں ایک قافلہ میں چلا جارہا تھا، راستہ میں ایک اجڑی ہوئی بستی آئی، مجنوں سواری سے اتر گیا اور قریب جاکر جو دیکھا تو وہاں صرف کھنڈرات پڑے تھے، مجنوں ان کھنڈرات سے لپٹ گیا اور چومنے اور پیار کرنے لگا۔ لوگوں نے کہا یہ پاگل ہوگیا ہے۔ تو وہ کہتا ہے۔

مررت علی الدیار دیار لیلیٰ	اقبل ذاالجدا راو ذاالجدارا
وماحب الدیار شغفن قلبی	ولکن حب من سکن الدیارا

آج میں جہاں سے گذر رہا ہوں وہاں کبھی لیلیٰ رہتی تھی، مجھے ان کھنڈروں سے محبت نہیں ہے ان دیواروں سے محبت نہیں ہے مجھے محبت اس لیلیٰ سے ہے جو لیلیٰ کبھی ان مکانوں میں آباد ہوتی تھی، اسی لیلیٰ کی محبت کی وجہ سے آج ان کھنڈروں کو پیار کررہا ہوں۔

حب رسول ﷺ کا تقاضہ حب رسول کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ کے ساتھ جس چیز کو بھی نسبت حاصل ہوجائے وہ ہمارے نزدیک محترم اور محبوب ہے۔ خاندان رسول ﷺ تو بڑی چیز ہے، مٹی کے وہ ذرات بھی کہ جن پر سرکار دوعالم ﷺ کے قدمِ مبارک پڑے ہیں ہمارے سروں سے زیادہ محترم ہیں۔

امام مالکؒ تمام عمر مدینہ میں جوتا نہیں پہنے میں ویسے ہی نہیں کہہ رہا ہوں۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تمام عمر مدینہ منورہ میں جوتا نہیں پہنے۔ کسی نے کہا کہ حضرت! آپ جوتا کیوں نہیں پہنتے ؟ فرمایا کہ کیا بتاؤں، میں جوتا اس لئے نہیں پہنتا ہوں کہ مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر میں جوتا پہن کر چلوں تو کہیں میرا قدم اس جگہ پر نہ

پڑجائے جہاں سرکار دوعالم ﷺ کا قدم مبارک پڑا ہو۔ کیونکہ آپ ﷺ کے قدم جن ذرات پر پڑے ہیں میں اس قابل نہیں کہ ان ذرات کی بے حرمتی کروں۔ اندازہ لگایئے حب رسول ؐ کے تقاضہ کا! سرکار دوعالم ﷺ کے نواسہ ہونے کی وجہ سے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما سے تمام خلفائے راشدین نے محبت کیا ہے۔ ان کی عزت واحترام میں کسی نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

حضرت عثمان ؓ کے قاتل مفسد تھے مصلح نہیں تھے

حضرت عثمان غنیؓ پر جب مفسدوں نے حملہ کیا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان دونوں صاحبزادوں کو ان کے دروازے پر مقرر کردیا تاکہ کوئی فسادی اندر نہ جاسکے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر حملہ کرنے والے مفسد تھے، مصلح نہیں تھے۔ اور آجکل کی سیاست اس کے بالعکس کہتی ہے۔ آج ہر باطل کا جھنڈا لیکر اٹھنے والا آدمی، نعرہ حق کا لگاتا ہے۔ کام باطل کا کرتا ہے، "کوئی آدمی اپنے دہی کو کھٹا نہیں کہتا" جو لوگ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والے تھے اپنے آپ کو مصلح قرار دیتے تھے لیکن در حقیقت یہ لوگ مفسد تھے۔ یہ لوگ اسلام میں تفرقہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔

سیدنا حضرت عثمان غنیؓ کا خطاب

حضرت عثمان غنیؓ کوفہ سے تشریف لائے اور مسلمانوں سے خطاب کرکے کہا، اے مسلمانو! یاد رکھو! اگر آج تم نے ایک مسلمان کو شہید کرنے کیلئے میان سے تلوار نکال لی تو قیامت تک یہ تلوار میان میں واپس نہیں جائے گی، مسلمانوں کا خون بہتا رہے گا۔ اور فرمایا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو کبھی تم ایک امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکو گے۔ کبھی ایک امیر کے تابع ہوکر جہاد نہیں کرسکو گے۔ اور ویسا ہی ہوا۔ علامہ اقبال نے اسی کا مرثیہ پڑھا ہے۔ فرمایا کہ ؎

امت بودی امم گردیدہ ای ——— بزم خود را خود فاشیدہ ای

رسول اللہ ﷺ نے تو ایک امت چھوڑی تھی اب کتنی امتیں ہیں؟ یہ انتشار ہم

نے خود پیدا کیا ہے

امت بودی امم گردیدہ ای | بزم خود را ہنگ خود فاشیدہ ای
آنچہ با تو خویش کردی کس نہ کرد | روح پاک مصطفیٰ آمد بدرد

فرمایا کہ امت میں انتشار پیدا کر کے تو نے اتنا برُا کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی روح تڑپ گئی۔

عقیدہ حیات رسول ﷺ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ جہاں آرام فرما رہے ہیں وہاں آپ آج بھی زندہ اور باحیات ہیں۔ اور آپ ﷺ کو جس چیز سے سب سے زیادہ خوشی ہوتی ہے وہ مسلمانوں کا ایک دوسرے سے پیار و محبت کرنا ہے اور جس چیز سے آپ ﷺ کا دل دکھتا ہے وہ مسلمانوں کا آپسی تفرقہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فتنہ پردازوں کی دھمکی بہرحال: مفسدوں کی یہ جماعت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کیلئے آئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت مدینہ میں ہی تھے، ان مفسدوں نے ان کے دامن کو بھی داغدار کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ ہمارا ساتھ دیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں کبھی تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ اگر آپ ہمارا ساتھ نہیں دیں گے تو ہم پبلک (PUBLIC) (عوام) میں جاکر یہ کہیں گے کہ ہمیں اس کام کیلئے حضرت علیؓ نے ہی بلایا تھا۔ نعوذ باللہ، نعوذ باللہ!

جب بلوائیوں نے حضرت عثمان غنیؓ کے مکان کا محاصرہ کر لیا تو حضرت علیؓ نے اپنے دونوں صاحبزادوں کو ان کے دروازے پر مقرر کر دیا تاکہ کوئی فسادی اندر نہ جاسکے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت علیؓ سے مشورہ کرنا چاہا، یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچائی گئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ مشورہ کیلئے حضرت عثمان غنیؓ کے گھر تشریف لارہے تھے کہ ان فسادیوں نے انہیں آنے سے روک دیا، حضرت

علی کرم اللہ وجہہ نے اپنا صافہ اتار کر پھینکا اور فرمایا کہ اس کو عثمان غنیؓ تک پہنچادو اور ان سے یہ کہدو کہ میں آپ کے بلانے پر آنا چاہتا ہوں مگر یہ فسادی مجھے آنے نہیں دے رہے ہیں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت حضرت علیؓ نے دونوں صاحبزادوں کو دروازہ پر مقرر کر دیا تھا (۱)۔ اس لئے وہاں سے کسی فسادی کو اندر جانے کی مجال نہ تھی چنانچہ پیچھے کی جانب سے مکان پر چڑھ گئے اور اندر گھس کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر حملہ کر دیا۔ (محمد بن ابی ابکر نے) ان کی ڈاڑھی پکڑی، حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا کہ تیرا باپ اس ڈاڑھی کی عزت کرتا تھا، انہوں نے داڑھی چھوڑ دی۔ پھر لوگوں نے فوراً حملہ کر دیا، حضرت عثمان غنیؓ نے کوئی مقابلہ نہیں کیا اور لوگوں کو بھی مقابلہ کرنے سے منع کر دیا تھا، کیوں منع کر دیا تھا؟

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو منھ دکھانا ہے فرمایا کہ اس لئے منع کرتا ہوں کہ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں مجھے اللہ کے سامنے حاضری دینی ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو منھ دکھانا ہے، اگر میں خون ریزی کا جواب خون ریزی سے دوں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف اشارہ کر کے یہ فرمائیں کہ میری امت کا یہ پہلا آدمی ہے جس کے ذریعہ میری امت میں خون ریزی شروع ہوئی۔ یہ داغ اور یہ الزام میں اپنے سر لینا نہیں چاہتا، جان دینا پسند کرلوں گا مگر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دوں گا۔

بلوائیوں نے حضرت عثمان غنیؓ کو شہید کر دیا، وہ خاک و خون میں تڑپ رہے ہیں، بلوائیوں نے یہاں تک کوشش کی کہ آپ کی لاش کی بھی بے حرمتی کی جائے۔

اہل بیت میں سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا مقام اندازہ لگایئے! یہ کام ان لوگوں کا ہے جو اپنے آپ کو صرف مؤمن اور مسلمان ہی نہیں کہتے تھے بلکہ ان کا یہ بھی دعویٰ

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۷، ۱۸۹

تھا کہ ہم اہل بیت کی محبت قائم کرنے کیلئے آئے ہیں ۔ ارے بھائی! اہل بیت میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا مقام تو یہ ہے کہ ان کے نکاح میں سرکار دو عالم ﷺ کی یکے بعد دیگرے دو بیٹیاں آئی ہیں۔ اسی وجہ سے آپؓ کا لقب ذی النورین ہے (۱)۔ اور جب دوسری بیٹی کا انتقال ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس اور بیٹی نہیں ہے ۔اگر ہوتی تو اسکو بھی عثمان غنیؓ کے نکاح میں دے دیتا۔ کیا ان کی کوئی عزت نہیں ہے؟ بہر حال، جنت البقیع سے کچھ فاصلہ پر ایک جگہ ہے ("حش کوکب" جواب جنت البقیع کا ہی ایک حصہ ہو گیا ہے) جہاں حضرت عثمان غنیؓ کو دفن کیا گیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دور خلافت اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کا دور آیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اوپر بھی وہی پریشانیاں آئی۔ وقت بہت مختصر ہے، یہاں ایک بات عرض کرتا چلوں، مدینہ کی یہ حالت دیکھ کر حضرت علیؓ کا دل روتا تھا، مسجد نبوی میں وہ لوگ دندنا رہے تھے جو بلوائی تھے۔ نماز نہیں ہو رہی تھی، مسجد نبوی کی اس بے حرمتی کو دیکھ کر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں پہلا کام یہ کردں گا کہ دار الخلافہ مدینہ سے منتقل کر کے کوفہ لے جاؤں گا، اس لئے کہ حکومتوں کے تختے تو پلٹے جاتے ہی رہتے ہیں، مقابلے ہوتے ہی رہتے ہیں، میں نہیں چاہتا کہ اس کے بعد دیار رسول کے اندر پھر یہ ہنگامہ برپا ہو۔

چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے دار الخلافہ کوفہ منتقل کر دیا اور وہیں تشریف لے گئے، ان کے ساتھ بلوائیوں کی جماعت بھی جو آپؓ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی تھی کوفہ چلی گئی، انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھی بے انتہاء پریشان کیا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ خارجیوں نے ان کو بھی شہید کر دیا۔

میں نہیں چاہتا کہ خلافت کے دو ٹکڑے ہوں پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی

(۱) البدایہ والنھایہ ج ۷/ ۱۹۹

شہادت (۱) کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا گیا۔ اس کو بھی خلافت راشدہ کا ایک ضمیمہ کہنا چاہیے، حضرت حسنؓ اگرچہ حضرت علیؓ کے بیٹے ہی ہیں لیکن باپ کے بعد بیٹے کا خلیفہ ہونا اسلامی اصول کے خلاف نہیں ہے۔ بشرطیکہ ملت ان کی خلافت پر راضی ہو جائے اور اپنی رائے سے ان کو خلیفہ مقرر کرے۔ یہ قیصریت نہیں ہے یہ کسرائیت نہیں ہے۔

حضرت امام حسنؓ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دست برداری اختیار کی اور فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ خلافت کے دو ٹکڑے ہوں؛ چنانچہ خلافت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ کر دیا۔ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ کی وفات ۶۰ھ میں ہوئی۔ حضرت امیر معاویہؓ اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کر دیا۔ یزید فاسق و فاجر تھا۔ لاابالی اور شکاری تھا۔

لوٹا پکڑنے کی بھی اجازت نہ ہوتی

البتہ یہاں یہ بات سمجھ لیجئے جو میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ آج ہم جیسے لوگوں کو یا اس زمانے کے علماء کو جنہیں آپ "حضرت جی" کہتے ہیں۔ یا کہتے ہیں کہ یہ ہمارے حضرت ہیں یہ ہمارے قبلہ و کعبہ ہیں۔ یہ کیوں کہتے ہیں؟ ہم جیسے لوگوں کو قبلہ و کعبہ کیوں بناتے ہیں؟ اس لئے بناتے ہیں کہ آج امام غزالیؒ نہیں رہے، اس لئے بناتے ہیں کہ آج شیخ عبد القادر جیلانیؒ نہیں رہے، اسلئے بناتے ہیں کہ آج خواجہ معین الدینؒ چشتی اجمیری نہیں رہے، لیکن ایمانداری سے بتایئے کہ اگر آج شیخ عبد القادر جیلانیؒ کا زمانہ ہوتا، حسن بصریؒ کا زمانہ ہوتا، امام غزالیؒ کا زمانہ ہوتا تو ہم جیسے لوگوں کو تو میرے خیال میں ان کے پاؤں دھونے کیلئے لوٹا پکڑنے کی بھی اجازت نہ ہوتی۔

جسکا مطلب یہ ہے کہ ہم حضرت جی تو ہیں لیکن دورِ زوال کے حضرت جی ہیں۔

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۸، / ۲۲۰

دور عروج کے حضرت جی نہیں ہیں! اسی طرح دور صحابہ میں وہ آدمی فاسق وفاجر کہلاتا تھا جس کے اندر نماز کی مکمل پابندی نہیں. جو لہو ولعب اور شکار میں اپنا وقت گذارتا تھا. اور آج فاسق وفاجر کسے کہتے ہیں؟ اسے کہتے ہیں جس کے اندر داڑھی مونچھ کا صفایا ہے، جو فارغ البال ہے. یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں اکبر الہ آبادی کہتا ہے. فرمایا کہ ؎

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے

تو خوشی پھر اسکی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے (کلیات اکبر ص ۱۸۸ ج ۱)

آج فاسق وفاجر کسے کہتے ہیں؟ جو اسلام کو چوراہے پر رکھ کر ذبح نہ کرے، اسلام کو گالیاں نہ دے، باقی نماز روزہ، تو اسکا تو نام ہی نہیں ہے. تو اس زمانے کے فاسق اور دور صحابہ کے فاسق میں بڑا فرق ہے.

حضرت حسینؓ اور یزید کی ولیعہدی بہرحال! حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو ولی عہد مقرر کردیا. حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سامنے جب یہ مسئلہ آیا تو اپنے نانا کے لائے ہوئے دین کی حفاظت کی خاطر اس کے خلاف کھڑے ہوگئے. اس لئے نہیں کہ وہ خود خلیفہ بننا چاہتے تھے کیونکہ روحانی اعتبار سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے برگزیدہ اور محترم شخصیت پوری روئے زمین پر نہیں تھی. وہ نبی کے چشم وچراغ تھے. ایسا تھوڑا ہی تھا کہ خلافت لیکر ان کو کوئی چار چاند لگ جاتے.

اسلام میں خلافت وامامت بات دراصل یہ تھی کہ اسلام میں خلیفہ مقرر کرنے کا جو طریقہ ہے وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے مصلیٰ پر امام کو مقرر کرنے کا طریقہ ہے. اسلام نے اس کیلئے کچھ ہدایات دی ہیں، ضابطہ دیا ہے. اگر باپ کے بعد بیٹا، بیٹے کے بعد پوتا، پوتے کے بعد پڑپوتا کا طریقہ جاری ہوجائے تو قیصریت وکسرائیت اور اسلام میں کیا فرق رہیگا؟ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے صرف دین کی حفاظت کیلئے یہ طے کرلیا کہ میں اس ملوکیت اور بادشاہت کے طریقہ کو قطعاً قبول نہیں کروں گا اور اسلام میں جو شورائیت کا

طریقہ ہے اسکی حفاظت کروں گا۔

کاروان ایمان وعزیمت حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف جہاد کیا اور بہتر (۷۲) جاں نثاروں کو لیکر کوفہ کی طرف روانہ ہوگئے، کیونکہ کوفہ والوں نے آپ کو بہت سے خطوط لکھے تھے کہ آپ یہاں تشریف لایئے ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرکے آپ کا ساتھ دیں گے۔ مگر جیسا کہ مشہور ہے کہ "کوفی لا یوفی یعنی وفا نہیں کرتا۔

وقت کی کمی کا مجھے احساس ہے اسلئے مختصراً عرض کرتا ہوں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کوفہ تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر آپ سے یہ کہا گیا کہ آپ یزید کے ہاتھ پر بیعت کرلیں! آپ نے انکار کردیا، محرم کی ، تاریخ تھی کہ حضرت حسینؓ اور ان کے اہل خاندان پر خوراک اور پانی بند کردیا گیا۔ اور اس طریقہ سے یزید کی فوج سے جو ابن زیاد کی ہدایت پر کام کررہی تھی حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھ اہل بیت کے جتنے افراد تھے۔ سبھوں نے مقابلہ کیا اور مقابلہ کرتے ہوئے محرم الحرام کی دسویں تاریخ کو حضرت حسینؓ مع اپنے جاں نثاروں کے شہید ہوگئے (۱)۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ایک بد بخت آگے بڑھا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر آپ کی گردن مبارک سے الگ کردیا۔ اس طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے خاک و خون میں تڑپ کر اس بات کی شہادت دے دی کہ میں اپنے نانا کے لائے ہوئے دین کی حفاظت کیلئے سب کچھ قربان کرسکتا ہوں مگر اس پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

شہادت حسین کا پیغام انسانیت کے نام حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت قیامت

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۸ / ۱۸۲

تک ہمیں اور آپ کو یہ دعوت دیتی رہے گی کہ اگر دین مٹ رہا ہو، اگر اسلام کا کوئی کونا دب رہا ہو، اگر اسلام مجروح ہو رہا ہو تو اسکی حفاظت لازم وضروری ہے، اگر اس کیلئے ضرورت پڑی تو اسی طریقہ کو اختیار کیا جا سکتا ہے جس طریقہ کو خاک وخون میں تڑپ کر میں نے اختیار کیا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ آج ان شہداء کی قربانیوں کو ہم اور آپ فراموش کر بیٹھے ہیں۔ اور دین کے اندر بہت سی ایسی رسومات، بہت سے ایسے طریقے ہم نے گھڑ لیا ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اس طرح آج ہم اور آپ ان کی قربانیوں کی صحیح قدر نہیں کر رہے ہیں۔

دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام شہدائے کربلا کو آخرت میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام اور اونچے درجے عطا فرمائے اور ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ دعا کیجئے کہ اے اللہ! ہمیں ان شہداء کربلا کے صدقہ میں ان کے اسوہ اور ان کی سنت پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔

آمین

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا

اتباعہ وارنا الباطل وارزقنا اجتنابہ

سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون

وسلام علی المرسلین

والحمد للہ رب العلمین



عاشورہ کی فضیلت

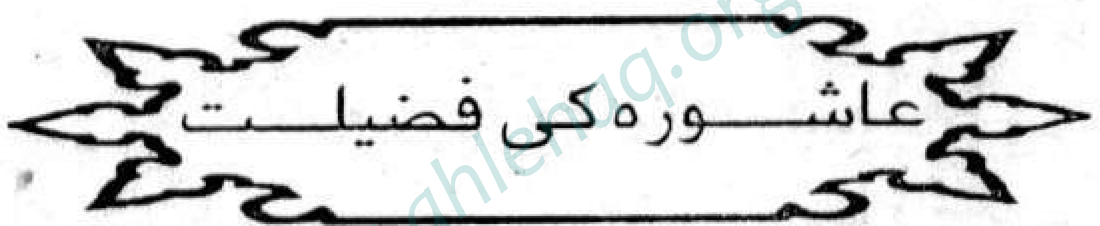
علماء نے لکھا ہے کہ رمضان کے فرض روزہ کے بعد نفلی روزوں میں سب سے افضل روزہ عاشوراء کا روزہ ہے۔ اور اسکی وجہ یہ لکھی ہے کہ رمضان کے فرض روزوں کا حکم آنے سے پہلے عاشورہ کا روزہ فرض تھا۔ جب رمضان کے تیس روزے فرض ہوگئے تو عاشورہ کی فرضیت ختم ہوگئی۔ لیکن یوم عاشورہ بہرحال وہ دن ہے کہ اکثر قوموں کے اوپر اس دن کا روزہ فرض تھا اس لئے فرض روزوں کے بعد نفلی روزوں میں سے سب افضل یوم عاشورہ کا روزہ ہے۔ معلوم ہوا کہ اس روزہ کی بڑی فضیلت ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جو آدمی عاشورہ کا روزہ رکھے تو وہ اس کیلئے ایک سال کے صغیرہ گناہوں کا کفارہ ہوجائیگا۔

خیر! تو بات اس پر چل پڑی تھی کہ عاشورہ کا روزہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے۔ مگر یہ گناہ گناہ صغیرہ ہے۔ عاشورہ کی دوسری فضیلت یہ ہے کہ اس دن اپنے اپنے گھروں میں کھانا پکانے میں فراخ دلی اور وسعت سے کام لیں تاکہ غرباء ومساکین کو بھی دے سکیں اور گھر والوں کو بھی افراط کے ساتھ کھلا سکیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ عاشورہ کے دن اگر آپ اپنے اہل و عیال کے لئے کھانے میں وسعت کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کیلئے پورے سال کی روزی میں وسعت فرمائیں گے۔ یہ دو فضیلتیں ہوئیں۔

(ارشاد حضرت خطیب الامت)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ

وَاَصْحٰبِهٖ اَجْمَعِيْنَ

اَمَّا بَعْدُ. فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَالْفَجْرِ ﴿۱﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿۲﴾ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴿۳﴾ وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرِ
﴿۴﴾ هَلْ فِي ذٰلِكَ قَسَمٌ لِذِي حِجْرٍ ﴿۵﴾ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ
﴿۶﴾ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴿۷﴾ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴿۸﴾
وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ﴿۹﴾ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ﴿۱۰﴾
الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۱﴾ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ﴿۱۲﴾ فَصَبَّ
عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿۱۳﴾ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾

سُوْرَةُ الْفَجْرِ

صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيْمِ وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

بزرگان محترم اور برادران عزیز! گذشتہ جمعہ سورہ ممتحنہ کی آیتوں کے بارے میں بعض مضامین پیش کئے گئے تھے اور آج اس سے آگے کی آیتوں کے متعلق کچھ کہنا چاہیے تھا لیکن آج ہم اور آپ جس مقدس اور مبارک مہینہ میں موجود ہیں اسکا تقاضہ یہ ہے کہ اس مہینہ سے متعلق احکام ومسائل عرض کئے جائیں۔

عربی زبان سے ناواقفیت کا انجام

حضرات! چاند کے بارہ مہینوں میں یہ سب سے پہلا مہینہ ہے جسکا نام "محرم الحرام" ہے۔ بعض ایسے دوست جو عربی زبان سے دور ہیں خاص کر آجکل ان عربی الفاظ کا ترجمہ بھی ان کے ذہنوں میں نہیں رہا جو اردو زبان میں بھی استعمال ہوتے ہیں یہ لوگ بے چارے بعض اوقات پریشان ہوجایا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بھائی! یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اسلام کے اندر جو چیزیں ناجائز اور ممنوع

ہیں اسلام نے ان کو "حرام" کہا ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ مسجد کے ساتھ بھی لفظ حرام لگا کر "مسجد الحرام" کہا جاتا ہے۔ محرم کے ساتھ بھی لفظ حرام لگا کر "محرم الحرام" کہا جاتا ہے؟ دراصل انہیں لفظ حرام کا معنی معلوم نہیں ہے۔ اور اس معاملہ میں صرف آپ لوگوں کا قصور نہیں ہے۔

ایک روشن دماغ کا اعتراض پاکستان کے ایک بہت بڑے تعلیم یافتہ، ایک بڑے سائنٹسٹ (SCIENTIST) (انکا نام لینا غیبت میں داخل ہو جائیگا اس لئے نام نہیں لیتا) ایک مجلس نکاح میں موجود تھے۔ معاشرہ اور سوسائٹی (SOCIETY) کے لوگ بھی موجود تھے۔ نکاح میں نے ہی پڑھایا۔ جب میں نکاح خوانی سے فارغ ہو گیا اور جیسا کہ رواج ہے دولہا اٹھ کر گھر میں سلام کرنے کیلئے گیا تو وہ صاحب مجھ سے پوچھنے لگے کہ مولانا! آپ نے جو ابھی نکاح پڑھایا ہے اور اس کے اندر جو خطبہ پڑھا ہے اس میں آپ نے "رقیب" کا بھی ذکر کیا ہے؟ یہ کیا بات ہے؟ میں بہت پریشان ہو گیا۔ میں نے کہا کہ یہ ایسی بات ہے کہ لوگ ابھی لڑکی والے کے گھر پر ہی ہیں اگر ان کے کان میں یہ پڑجائے کہ مولانا نے "رقیب" کا بھی ذکر کیا ہے تو وہ کیا کہیں گے؟ دولہا کیا سوچے گا؟ میں پریشان ہو گیا۔ میں نے کہا بھائی! میں نے آپ کی بات سمجھی نہیں۔ کہنے لگے کہ ابھی آپ نے جو خطبہ پڑھا اس میں رقیب کا ذکر کیا تھا۔ میں نے کہا، اوہو! اب میں سمجھ گیا۔ میں نے یہ آیت پڑھی تھی۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَآءً ۚ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ ٱلَّذِى تَسَآءَلُونَ بِهِۦ وَٱلْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ﴿١﴾

اردو اور عربی زبان کا فرق میں نے کہا، اب بات میرے سمجھ میں آگئی۔ اس آیت میں جو لفظ رقیب آیا ہے آپ اسکا ذکر فرما رہے ہیں؟ انہوں نے کہا، جی ہاں! میں

نے کہا، صاحب! بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ کو رقیب کے معنی بھی معلوم نہیں ہے۔ رقیب تو خدا کے ناموں میں سے ایک نام ہے، یہ عربی لفظ ہے، اس کے معنی ہیں محافظ، نگران، یہاں اس آیت میں یہی معنی مراد ہے، اردو والے اس لفظ کو "رقیب روسیاہ" کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، جسکا مطلب یہ ہے ایک محبوب کے دو عاشق ہیں یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے رقیب ہیں۔ یعنی دونوں ایک دوسرے کی گھات میں رہتے ہیں کہ کہاں جاتا ہے، کب محبوب سے ملتا ہے اور کیا کیا کرتا ہے؟ تو عربی میں اس کے معنی محافظ و نگہبان کے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا

کے معنی ہیں اللہ تمہارے اوپر محافظ و نگہبان ہے۔

جب اتنے بڑے تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ حال ہے تو اگر آپ لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

محرم کو محرم الحرام کیوں کہا جاتا ہے؟ دراصل لفظ حرام کے معنی ہیں "قابل احترام" "مسجد الحرام" کے معنی ہیں وہ مسجد جو عظمت والی ہے، احترام والی ہے۔ محرم الحرام کے معنی ہیں محرم کا مہینہ جو قابل احترام ہے۔ اب رہی یہ بات کہ ان چیزوں کو حرام کیوں کہا جاتا ہے کہ اسلام میں جن چیزوں کی بندش اور ممانعت ہوتی ہے؟ اسکی وجہ یہ ہے کہ بندش اور ممانعت کبھی کبھی اس چیز کی عظمت کی وجہ سے ہوتی ہے، جیسے انسان کا گوشت ممنوع اور حرام ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انسان کی عظمت اتنی ہے کہ اس کی وجہ سے اس کے کھانے کو ممنوع قرار دیا گیا، انسانی عظمت اور اس کے احترام کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے گوشت کو اور دیگر تمام اجزاء کے استعمال کو ناجائز اور ممنوع قرار دیا جائے۔

بہرحال! چونکہ کبھی کبھی کسی چیز کے ناجائز اور ممنوع ہونے کی وجہ سے اسکی

عظمت وحرمت ہوتی ہے۔ اسکا احترام ہوتا ہے اس لئے ممانعت کیلئے لفظ حرام استعمال کیا جاتا ہے۔ اب آپ لوگ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ مہینہ چاند کے مہینوں میں سب سے پہلا مہینہ ہے اور ساتھ ساتھ قابل احترام بھی ہے اور یہاں سے اسلامی سنہ کا آغاز بھی ہوتا ہے۔

نظام قمری قبل از اسلام بھی رائج تھا یہاں یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ یہ نظام قمری اسلام کا ایجاد کردہ نہیں ہے بلکہ اسلام سے بہت پہلے سے رائج ہے۔ سرکار دوعالم ﷺ کی تشریف آوری کے قبل سے ہی یہ نظام جاری ہے۔ مہینوں کے یہی نام جو آج ہیں آپؐ سے پہلے بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اور آپ باسانی یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ جس دن دنیا میں تشریف لائے اس دن مہینہ ربیع الاول کا تھا اور تاریخ بارہ ۱۲ تھی۔

معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی ولادت اور پیدائش کے پہلے سے ہی یہ نام چلے آرہے ہیں۔ قرآن کریم نے بھی ان مہینوں کو انہیں رائج الوقت ناموں کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ فرمایا کہ

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ أُنْزِلَ فِیهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ

لفظ رمضان کی تحقیق رمضان ایک مہینہ کا نام ہے علمائے لغت نے لکھا ہے کہ لفظ "رمضان" درحقیقت اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، اسی لئے فرمایا کہ جب تم اس مہینہ کا نام لو تو خدا کے نام کی عظمت کے خاطر صرف "رمضان" نہ کہو بلکہ "ماہِ رمضان" کہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے رَمَضَانَ الَّذِیٓ أُنْزِلَ فِیهِ الْقُرْاٰنُ نہیں کہا بلکہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ أُنْزِلَ فِیهِ الْقُرْاٰنُ کہا، ماہ رمضان کہا۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ یہ نظام قمری اسلام کے پہلے سے ہی چلا آرہا ہے۔

سنہ ہجری اسلام کی ایجاد کردہ ہے فرق صرف اتنا ہے کہ قبل از اسلام اس کے

آگے سنہ ہجری نہیں لکھا جاتا تھا اور آج ہم اور آپ لکھتے ہیں۔ آج لکھا جائے گا ۱۳۹۴ھ جسکا مطلب یہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی اس واقعہ کو ۱۳۹۴ سال ہو گئے۔

بہرحال! یہ نظام اور یہ مہینے ۱۴۰۰ سال سے بھی بہت پہلے سے چلے آرہے ہیں البتہ جب دنیا میں اسلام آیا تو اسلام نے اس قمری نظام کو مہینوں کے ناموں کے ساتھ ہی لے لیا۔ نہ نظام میں کوئی تبدیلی کی نہ مہینوں کے ناموں میں کوئی تبدیلی کی۔ پورا نظام برقرار رکھا صرف ایک تبدیلی کی۔ اور وہ تبدیلی یہ تھی کہ تاریخ کے آگے سنہ ہجری لکھا گیا۔

سنہ ہجری کا آغاز اور چند پیچیدگیاں واقعہ یہ ہوا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مسلمانوں کے درمیان جب اس نظام کو اپنانے کی بات آئی تو یہ مسئلہ درپیش آیا کہ جب ہم اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ بنانا چاہتے ہیں تو اسلام کے کسی عظیم واقعہ سے اسے شروع کرنا چاہئے۔ کس واقعہ سے شروع کرنا چاہئے؟ سب سے زیادہ عظیم واقعہ تو خود سرکار دوعالم ﷺ کی ولادت و پیدائش کا واقعہ ہے۔ لیکن اسلام کا مزاج اس سے میل نہیں کھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی پیدائش اور آپ کی ولادت پاک کو مبدا تاریخ نہیں بنایا گیا۔ یہاں سے تاریخ کی ابتداء نہیں کی گئی۔ اگر حضور اکرم ﷺ کی پیدائش مبدا تاریخ ہوتی تو آج ہم اور آپ جو ۱۳۹۴ھ لکھتے ہیں اس میں ۵۳ سال اور شامل کئے جاتے۔ چالیس سال نبوت سے پہلے کے اور تیرہ سال نبوت کے بعد مکی زندگی کے۔ معلوم ہوا کہ ولادت کے واقعہ سے تاریخ شروع نہیں کی گئی ہے۔

اس طرح آپ کی عمر جب چالیس سال کی ہوئی تو ایک اہم ترین واقعہ یہ پیش آیا کہ حضرت جبرئیل امین تشریف لائے اور آپ ﷺ سے کہا،

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ﴿١﴾ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴿٢﴾

یعنی آج آپ پر وحی نازل ہوئی ہے اور اللہ نے آپ کو منصب نبوت پر سرفراز فرمایا ہے۔ لیکن اس واقعہ سے بھی تاریخ کو شروع نہیں کیا گیا۔ اگر اس واقعہ سے تاریخ کو شروع کیا جاتا تو ۱۳۹۴ھ میں ۱۳ سال کا اور اضافہ ہونا چاہئے تھا۔ تو اس واقعہ سے بھی تاریخ شروع نہیں ہوئی۔

ابتداء سنہ ہجری کا پس منظر دراصل مبدا تاریخ کا رواج اور اسکی تعین کا واقعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں پیش آیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس زمانے میں لین دین میں رقموں کی ادائیگی کیلئے چٹھیاں اور پرچے لکھے جاتے تھے۔ جسے آجکل آپ نے مہذب شکل میں چک (CHEQUE) بنادیا، تو ایک کاغذ تھا، اس پر رقم کی ادائیگی کی تاریخ ۲ شعبان لکھی ہوئی تھی لیکن یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ رقم گذشتہ شعبان میں ادا ہوچکا ہے یا اگلے سال جو شعبان آرہا ہے اس وقت تک ادا کیا جائیگا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مشورہ کیا کہ ہماری تاریخ کا ایک مبدا ہونا چاہئے تاکہ ہم لکھ سکیں کہ یہ دسواں سال ہے۔ یہ بیسواں سال ہے اور یہ پچاسواں سال ہے۔ مبدا کسے بنائیں؟ ابتداء کہاں سے کریں؟ صحابہ نے آپس میں مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ اسلام کی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ ہے جو یادگار بنانے کے قابل ہے۔ اور وہ ہجرت کا واقعہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ مکہ سے ہجرت فرماکر مدینہ تشریف لے آئے۔ چنانچہ مبدا تاریخ اسی ہجرت کے واقعہ کو بنایا گیا۔ کیونکہ ہجرت کے بعد اسلام کی مغلوبیت ختم ہوگئی، اسلام کی کمزوری ختم ہوگئی، اسلام کو عروج ملا، اسلام کو غلبہ اور فروغ ملا۔

سنہ ہجری کی ابتداء ماہ محرم سے کیوں؟ بہرحال، ہجرت کے واقعہ کو مبدا تاریخ تو بنادیا گیا مگر اس میں ایک دقت اور پریشانی یہ پیدا ہوئی کہ اگر واقعہ ہجرت کو مبدا تاریخ

بنایا جائے تو اگرچہ ہم نے قمری نظام اس کے مہینوں کے نام کے ساتھ اپنا لیا مگر قمری نظام تو محرم الحرام سے شروع ہوتا ہے جبکہ ہجرت کا واقعہ ربیع الاول میں پیش آیا جسکا مطلب یہ ہے کہ پھر ہمیں یہ نظام بنانا ہوگا کہ ربیع الاول کی تیرہ تاریخ سے ہمارا سال شروع ہو اور ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو ختم ہوجائے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے مشورہ کیا، اور یہ طے ہوا کہ سال ہمارا محرم کے پہلے ہی دن سے شروع ہوگا اور یہ جو دو مہینے ۱۲ دن یعنی محرم، صفر اور ربیع الاول کے ۱۲ دن کا کسر ہے اس کا اعتبار نہ کیا جائے۔ تو ہجرت کے واقعہ کو یادگار بنانے کیلئے اس کو مبدا قرار دیا گیا لیکن سال ہمارا شروع ہوتا ہے محرم الحرام سے ہی۔

سنۂ ہجری کا پیغام چنانچہ یہ مہینہ جو اب شروع ہوا ہے اس کے متعلق لکھا جائے گا۔ محرم الحرام ۱۳۹۴ھ۔ یہ مہینہ ایک تو ہمیں ان سنگین حالات اور خونیں واقعات کو یاد دلاتا ہے کہ جن سے مجبور ہو کر حضور اکرم ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے۔ اس مہینہ کے آتے ہی ہمارے ذہنوں میں وہ واقعات تازہ ہوجاتے ہیں اور تاریخ کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ آنے والی نسلیں اس سے متعلق واقعات کو یاد رکھیں۔ اگرچہ آج مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے کہ جس کو نہ قمری مہینے یاد ہیں اور نہ اسکی تاریخیں انہیں معلوم ہیں اور نہ وہ اس سے واقف ہیں کہ اسلامی تاریخ کا مبدا ہجرت کا واقعہ ہے۔

دوسرے یہ کہ اس مہینہ کے بعض دنوں کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فضیلتیں بیان فرمائی ہیں۔ نیز قرآن کریم کی بھی ایک آیت ہے جس میں دس راتوں کا ذکر ہے لیکن مراد ان راتوں کے ساتھ ساتھ ان کے دن بھی ہیں۔

اسلامی تاریخ کی ابتداء رات سے ہوتی ہے یہاں آپ ایک طالبعلمانہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ صاحب! قرآن میں دن کا لفظ تو ہے نہیں، راتوں کا ذکر ہے فرمایا کہ

وَالْفَجْرِ ﴿١﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿٢﴾ دس راتوں کا ذکر ہے۔ اس کے جواب میں مفسرین نے لکھا ہے کہ ہمارے یہاں تاریخ کا آغاز دن سے نہیں ہوتا ہے، رات سے ہوتا ہے، غروب آفتاب سے ہوتا ہے۔ تو راتوں کا ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رات اور دن دونوں مراد ہے۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم یہ بتلا رہا ہے کہ دس دن اور دس راتیں ایسی ہیں کہ جنکی اللہ تعالیٰ قسم کھا رہا ہے۔ وہ کونسا دن اور کونسی راتیں ہیں؟

مفسرین کی ایک جماعت نے کہا کہ وہ ذی الحجہ کے دس دن اور راتیں ہیں۔ مگر بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ وہ محرم الحرام کے دس دن اور راتیں ہیں۔ یعنی یکم محرم الحرام سے لیکر عاشورہ کے دن تک دس دن اور اسکی راتیں خصوصی عبادت اور بندگی کے قابل ہیں، ان دنوں میں روزے رکھنے چاہئیں۔

طلوع اسلام کے وقت دنیا کا نقشہ حضور اکرم ﷺ ہجرت کر کے جب مدینہ تشریف لائے تو وہاں بڑی تعداد میں یہود آباد تھے۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ آپ حضرات سے کہا ہے کہ جب دنیا میں اسلام کا سورج طلوع ہوا ہے اس وقت آبادی کا نقشہ اس طریقہ پر تھا کہ مکہ میں مشرکین آباد تھے، شام اور یمن کے علاقے میں نصرانی آباد تھے اور مدینہ میں یہود آباد تھے۔

مدینہ منورہ کا پہلا محرم جب حضور اکرم ﷺ ہجرت کر کے ربیع الاول کے مہینہ میں مدینہ تشریف لائے اور اس کے تقریباً دس مہینے کے بعد جب سال شروع ہوا اور پہلی مرتبہ محرم الحرام کا چاند نکلا تو آپ ﷺ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ یہود نے عاشورہ یعنی محرم کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھا ہے۔ چونکہ ان لوگوں کا دین آسمانی دین تھا، یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، توریت پر ایمان رکھتے تھے اس لئے حضور اکرم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ تم جا کر یہود کے علماء سے دریافت کرو کہ آج انہوں نے کیسے روزہ رکھا ہے؟

یہود کا طریقہ چنانچہ ان سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ آج ہمارے یہاں یوم تشکر ہے، آج ہماری نجات کا دن ہے۔ آج ہم بارگاہ خداوندی میں روزہ کی عبادت کے ذریعہ اس بات کا شکرانہ ادا کرتے ہیں کہ آج ہی کے دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو فرعون کے پنجہ سے نجات عطا فرمائی تھی اور فرعون کو اس کے لشکر سمیت غرق کردیا تھا۔ (۱) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر آج اس لئے روزہ رکھا جاتا ہے کہ آج کے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم فرعون کے پنجۂ ظلم سے آزاد ہوئی تھی تو ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم بھی روزہ رکھیں۔

مسلمانوں کا طریقہ لیکن فرمایا کہ روزہ رکھو مگر یہود کی مخالفت کرو۔ یعنی صرف دسویں تاریخ کا روزہ مت رکھو بلکہ نویں یا گیارہویں تاریخ کے ساتھ ملاکر روزہ رکھو۔ یہ اسلام کا طریقہ ہے اور وہ یہود کا طریقہ ہے۔ دونوں میں خلط ملط نہیں ہونا چاہئے۔ اس وقت سے عاشورہ کا روزہ نویں تاریخ یا گیارہویں تاریخ کے ساتھ ملاکر رکھنا رسول اکرم ﷺ کی سنت ہے اور امت مسلمہ ان دونوں دنوں کا روزہ سنت کے طور پر رکھتی چلی آرہی ہے۔

یوم عاشورہ کے روزہ کی فضیلت علماء نے لکھا ہے کہ رمضان کے فرض روزہ کے بعد نفلی روزوں میں سب سے افضل روزہ عاشوراء کا روزہ ہے۔ اور اسکی وجہ یہ لکھی ہے کہ رمضان کے فرض روزوں کا حکم آنے سے پہلے عاشورہ کا روزہ فرض تھا۔ جب رمضان کے تیس روزے فرض ہوگئے تو عاشورہ کی فرضیت ختم ہوگئی۔ لیکن یوم عاشورہ بہرحال وہ دن ہے کہ اکثر قوموں کے اوپر اس دن کا روزہ فرض تھا اس لئے فرض روزوں کے بعد نفلی روزوں میں سے سب افضل یوم عاشورہ کا روزہ ہے۔ معلوم ہوا کہ اس

(۱) بخاری شریف / ۲۰۳۹، مسلم / ۱۹۱۰، ابوداؤد / ۲۰۸۸

روزہ کی بڑی فضیلت ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جو آدمی عاشورہ کا روزہ رکھے تو وہ اس کیلئے ایک سال کے صغیرہ گناہوں کا کفارہ ہو جائیگا۔

کفارہ سیئات کا مطلب ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک سال کے صغیرہ گناہ معاف ہو جائیں گے، کبیرہ گناہ اور حقوق العباد معاف نہیں ہوتے، کفارہ کا یہ مطلب آپ لوگوں کے ذہنوں میں رہنا چاہیے۔ اس لئے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی کا انتقال ہو گیا اور اس کے ذمہ لوگوں کے قرضے بھی ہیں، اس کے ذمہ نمازیں بھی ہیں، روزے بھی ہیں تو اس کے لئے ایصال ثواب کے طور پر قرآن کریم پڑھ لو سب معاف ہو جائے گا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔

اصل بات تو یہ ہے کہ خدا کے یہاں اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا، یہ نہ میں کہہ سکتا ہوں نہ آپ کہہ سکتے ہیں اور یہ بھی اس شخص کے بارے میں کہہ رہا ہوں جسکی زندگی آپ کے سامنے ہے اور آپ نے اسے دیکھا ہے کہ اسکی نمازیں چھوٹ گئی ہیں، اس کے روزے چھوٹ گئے ہیں اور اس کے ذمہ انسانوں کے حقوق بھی رہ گئے ہیں بلکہ اس شخص کے بارے میں بھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں جس کی زندگی ہماری نظروں میں بڑی مقدس زندگی ہے، تقویٰ کی زندگی ہے، ولیوں کی زندگی ہے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ اللہ کے یہاں اس کے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا۔

کیونکہ ہم دنیا میں جو کچھ اس کے متعلق کہتے ہیں ہمیں کاغذ کے اوپر لکھا ہوا ایک ضابطہ دے دیا گیا ہے اس ضابطے کی بنیاد پر ہم حکم لگاتے ہیں لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اسی ضابطے کی بنیاد پر آخرت میں بھی اس کے ساتھ برتاؤ ہو۔ اس لئے کہ آخرت میں جو برتاؤ ہوگا وہ اللہ کے مراحم خسروانہ کے ساتھ ہوگا۔ ضابطہ کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ معاملہ نہیں فرمائیں گے۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ ضابطہ کو لیکر بیٹھ جائیں گے تو شاید

سرکار دوعالم ﷺ اور دیگر پیغمبروں کے علاوہ ایک بھی امتی اس ضابطہ کے اوپر پورا نہیں اترے گا۔ کسی کی نجات نہیں ہوگی۔

میدان حشر میں فضل عدل پر غالب ہوگا حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنی صفت عدل کا چوغہ اتار کر رکھ دے گا اور یہ فرمائے گا کہ آج میں عدل کی بنیاد پر بندوں کے ساتھ معاملہ نہیں کروں گا اس لئے کہ اگر میں عدل کی بنیاد پر معاملہ کرنے کیلئے آجاؤں تو کوئی بھی بندہ بخشا نہ جائے گا۔ آج میں نے جو چوغہ پہنا ہے وہ فضل وکرم اور رحم کا چوغہ ہے لہذا آج عدل نہیں، فضل کی بنیاد پر معاملہ ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث میں بعض لوگوں کے ایسے ایسے واقعات بتلائے گئے ہیں جن کے متعلق ہم اور آپ ضابطہ کی رو سے کہیں گے کہ انہیں جہنم میں ڈالا جائے گا لیکن حدیث میں جب ہم اللہ تعالیٰ کا برتاؤ دیکھتے ہیں تو کچھ اور ہوتا ہے۔

ایک واقعہ حضرت امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ میدان حشر میں جب اللہ تعالیٰ فیصلہ کیلئے لوگوں کو طلب فرمائیں گے، اسوقت ملائکہ اور فرشتوں سے کہیں گے کہ جاؤ اور فلاں آدمی کو بلالاؤ فرشتے جب اس آدمی کو بلانے کیلئے جائیں گے تو وہ یہ کہے گا کہ مجھے عدالت میں بلا کر کیوں شرمندہ کیا جارہا ہے؟ اس لئے کہ عدالت میں تو وہ جاتا ہے جس کے مقدمہ میں جان ہو اور جس کے کیس (CASE) اور مقدمہ میں کوئی جان نہ ہو تو پھر وہ عدالت میں جاکر اپنا مقدمہ کیسے لڑے گا؟ میں تو وہ بدبخت ہوں کہ جسکی زندگی میں کوئی نیکی ہی نہیں ہے اس لئے مجھے عدالت میں بلا کر کیوں شرمندہ کیا جارہا ہے؟ مجھے تو یہیں سے جہنم میں پھینکنے کا حکم دے دیا جاتا تو بہتر تھا۔

دنیا کی ندامت معتبر ہے آخرت کی نہیں میرے دوستو! یہ احساس بہت اونچا احساس ہے لیکن کاش یہ احساس دنیا میں پیدا ہوجائے۔ اس لئے کہ آخرت کا

احساس معتبر نہیں ہے، آخرت میں تو سبھی کے احساسات درست ہوجائیں گے، سبھی کے جذبات درست ہوجائیں گے۔ لیکن اس سے فائدہ نہیں پہنچے گا۔ البتہ یہی احساس اگر کسی کے دل میں دنیا میں پیدا ہوجائے کہ کل کہیں میں اللہ کی عدالت میں لوگوں کے سامنے شرمندہ نہ ہوجاؤں۔ کہیں حضور اکرم ﷺ کے سامنے مجھے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ تو یہ احساس اور جذبہ ہی اس کی نجات کیلئے کافی ہے۔

علامہ اقبال کی رباعی یا قطعہ کہئے یاد آگیا۔ فرمایا کہ ؎

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر

روز محشر عذرہائے من پذیر

اے اللہ تُو تو کسی کا ماتحت نہیں ہے، تو مختار کل ہے۔ اگر تو مجھ جیسے گنہگار کے گناہ بخشدے تو تیرا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں ہے۔ لہذا تو میرے گناہوں کو بخش دے لیکن اگر مقدمہ ہی چلانا ضروری ہے تو فرمایا کہ ؎

یا اگر بینی حسابم ناگزیر ازنگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

اگر مجھ پر مقدمہ چلانا ضروری ہے تو رسول اللہ ﷺ کے سامنے نہ چلایئے، میں ان کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا۔ فرمایا کہ ؎

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر روز محشر عذرہائے من پذیر

یا اگر بینی حسابم ناگزیر ازنگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

وہ آدمی کہتا ہے کہ مجھے کیوں شرمندہ کیا جارہا ہے؟ سیدھے جہنم میں بھیجدیتے۔ لیکن چونکہ خدا کا حکم ہوگا اس لئے فرشتے اسکو لیکر اللہ کی عدالت میں پہنچیں گے۔ اللہ تعالیٰ بھری عدالت میں فرمائیں گے کہ اے فلاں! جا ہم نے تجھکو تیری نیکی کی وجہ سے بخش دیا۔ وہ حیران ہوکر کہے گا اے اللہ! تیری شان تو بڑی بے نیاز ہے، تو بڑے مجرموں کو بھی بخش سکتا ہے لیکن اے اللہ! ذرا یہ بتادے کہ میری وہ نیکی کونسی ہے کہ

جنکی بدولت تو نے مجھے بخشا ہے۔ میں نے تو کوئی نیکی ہی نہیں کی ہے۔

رحمت حق بہانمی جوید اندازہ لگایئے! خدا کی قسم! یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ایک ماں کے دل میں اپنے بیٹے کی اتنی محبت نہیں ہے جتنی اللہ کے دل میں اپنے بندے کی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ

رحمت حق بہانمی جوید رحمت حق بہانہ می جوید

اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے۔ اماتذکر اللیل کیا وہ رات تجھکو یاد نہیں رہی کہ جس میں سوتے ہوئے تیری آنکھ کھل گئی تھی اور کروٹیں بدلتے ہوئے تیرے منھ سے نکلا تھا۔ "اللہ" پھر تو سو گیا۔ تو انسان تھا، سونے کی وجہ سے تو بھول گیا، مگر میں خدا ہوں مجھے نیند نہیں آتی۔ مجھے یاد ہے، آج میں نے تجھے اس ایک مرتبہ اللہ کہنے کی وجہ سے بخش دیا۔

حقوق العباد توبہ سے معاف نہیں ہوتے میرے دوستو! ہمارے پاس ضابطہ کی بنیاد پر ہم کسی کو مؤمن و مسلمان اور کسی کو کافر کہتے ہیں لیکن اللہ کسی ضابطہ کا پابند نہیں ہے، اس کے یہاں کیا برتاؤ ہوگا کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور وہ ضابطہ جو گناہوں کی بخشش کے سلسلہ میں ہمارے پاس ہے اس میں لکھا ہے کہ حقوق العباد اور بعض حقوق اللہ کفارہ کے طور پر یا توبہ کے ذریعہ معاف نہیں ہوتے چاہے آپ زندگی بھر توبہ کرتے رہیں مگر معاف نہیں ہوتے۔

مثلاً اگر ایک آدمی اپنی ساری عمر نماز نہ پڑھے ہر سال رمضان المبارک کی ستائیسویں رات کو توبہ کرتے ہوئے یہ کہا کرے کہ اے اللہ! میں نے توبہ کرتا ہوں میری ساری نمازیں معاف کردے۔ یا کسی کا قرض لے لے اور رمضان کے ستائیسویں شب کو توبہ کرے کہ اے اللہ مجھے معاف کردے آئندہ کبھی نہیں کروں گا۔ اس سے حقوق العباد اور وہ حقوق اللہ معاف نہیں ہوتے کہ جنکی ادائیگی کا طریقہ شریعت نے بتادیا

ہے۔ ہاں: وہ حقوق اللہ معاف ہو جاتے ہیں کہ جس میں غلطی تو ہوگی لیکن اسکی ادائیگی کا کوئی طریقہ شریعت نے نہیں بتایا ہے یا وہ گناہ صغیرہ ہے۔

تو یہ جو ہم کسی کیلئے قرآن کریم پڑھ کر بخشتے ہیں، دعاء مغفرت کرتے ہیں یا خود اس میت کے پاس ایسی نیکی ہے جو گناہوں کیلئے کفارہ بنتی ہے مثلاً عاشورہ کا ایک روزہ رکھا ہے جو سال بھر کے گناہوں کیلئے کفارہ ہو جاتا ہے۔ ان تمام چیزوں سے صرف صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اور جو حقوق العباد ہیں وہ معاف نہیں ہوتے وہ تو ادا کرنا ہی ہے۔ لہذا حقوق العباد میں پوری احتیاط کرنی چاہیے۔

حقوق العباد کی اہمیت

یہی وجہ ہے کہ اسلام عبادت وبندگی اور تقوی کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنی اہمیت حقوق العباد کو دیتا ہے۔ اسلام اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ ہمیشہ زندگی میں حقوق العباد کو سامنے رکھو ہمیشہ اس کا خیال رکھو کہ کہیں کسی بندے کا حق تلفی نہ ہو جائے یہاں تک کہ اگر حقوق اللہ اور حقوق العباد کے درمیان مقابلہ ہو جائے یعنی ایک طرف خدا کا حق ہو اور ایک طرف بندے کا حق ہو تو بندے کے حق کو مقدم رکھو۔

اسی طرح اگر آپ کے اوپر دو قرضہ ہے۔ ایک قرضہ ایسے آدمی کا ہے جو صرف دو سو روپے ماہوار کا ملازم ہے وہ بیچارہ حاجتمند ہے اور ایک قرضہ آپ کے اوپر ایسے آدمی کا ہے جو لکھ پتی ہے۔ اب اگر آپ کے پاس اتنی تھوڑی سی رقم آئی کہ جس سے صرف ایک قرضہ ادا کیا جا سکتا ہے تو کیا دو سو روپے والے حاجتمند کو دیں گے یا لکھ پتی کو دیں گے؟

بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو صاحب بڑے مرتبہ کے آدمی ہیں، لکھ پتی ہیں پہلے ان کا قرضہ ادا کرنا چاہیے۔ لیکن نہیں! یاد رکھئے! ادائیگی کیلئے جو بنیاد ہے وہ بڑا ہونا نہیں ہے، حاجتمند ہونا ہے۔ لکھ پتی سیٹھ حاجت مند نہیں ہے لیکن یہ دو سو روپے پانے

والا حاجت مند ہے لہذا حاجتمند ہونے کی نبیاد پر پہلے اسی کو ادا کرو لکھ پتی کا بعد میں دیکھا جائے گا۔ اس کے گھر میں فاقہ تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

اب آپ کی سمجھ میں بات آگئی ہوگی کہ اگر حق اللہ اور حق العبد دونوں جمع ہوجائیں تو ظاہر ہے کے عظمت تو خدا کی ہے لیکن علمائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ کا حق ادا نہیں کیا تو اسکی خدائی میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ اسکی خدائی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن اگر بندے کا حق ادا نہیں کیا تو وہ بیچارہ مارا جائے گا۔ لہذا پہلے بندے کا حق ادا کرو خدا کا حق بعد میں دیکھا جائے گا اللہ ہو سکتا ہے کہ معاف کردے۔

ایک مثال مثال کے طور پر آپ کے اوپر قرضہ ہے اور اسکے ساتھ ساتھ آپ کے پاس کچھ رقم بھی ہے اور اس پر سال بھر گذر گیا ہے تو زکوۃ واجب ہوگئی۔ حج آپ کے اوپر فرض ہوگیا۔ اب آپ یہ سوچتے ہیں کہ خدا کے حق کا تقاضا یہ ہے کہ زکوۃ ادا کروں۔ حج کروں لیکن بندے کے حق کا تقاضا یہ ہے کہ قرضہ ادا کروں۔ اب میں کیا کروں؟ شریعت اسلامیہ آپ کو یہ حکم دیتی ہے کہ تم زکوۃ کی فکر نہ کرو۔ حج کی فکر نہ کرو سب سے پہلے بندے کا حق ادا کرو۔ اسکا قرضہ ادا کرو۔ اس کے بعد اگر زکوۃ کیلئے رقم نہیں بچتی ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ کوئی مضائقہ نہیں ہے اس لئے کہ جب آپ نے وہ رقم پوری کی پوری قرضے میں ادا کردی تو اب آپ کے اوپر زکوۃ واجب نہیں رہی۔ اب آپ کے اوپر حج بھی فرض نہیں رہا۔ اسلام یہ کہتا کہ پہلے تم زکوۃ ادا کرو۔ پہلے تم حج ادا کرلو پھر جو بچے وہ قرضہ میں دے دینا نہیں؛ فرمایا کہ حقوق العباد پہلے اور حقوق اللہ بعد میں۔

تقوی کا معیار سفید پوشی نہیں ہے میرے دوستو! جب شریعت اسلامیہ نے حقوق العباد کی اتنی اہمیت دی ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کے تقوی کا معیار نفلیں پڑھنا نہیں ہے۔ زیادہ تلاوت کرنا نہیں ہے لمبا کرتا پہننا نہیں ہے۔ تقوی کا

معیار انسانوں کے حقوق ادا کرنا ہے۔ اگر ایک انسان نفلی عبادتیں تو بہت کرتا ہے لیکن حقوق العباد کو پامال کرتا ہے۔ اسکی کوئی اہمیت نہیں دیتا تو وہ شریعت کی نظر میں متقی اور پرہیز گار نہیں ہے۔ اسکی زندگی کو تقویٰ کی زندگی نہیں کہہ سکتے۔ ایسی زندگی گذارنے والے بہت سے لوگ ہیں۔

مولانا تھانوی کی عینی شہادت حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک صاحب کانپتے ہوئے، گھبراتے ہوئے میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے کہا۔ کیا ہوا بھائی! کہنے لگے، حضور! مجھ سے گناہ ہو گیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ کوئی عابد وزاہد آدمی ہے کہ اس سے ایک گناہ سرزد ہو گیا ہے جس کیوجہ سے بہت بے چین ہے۔ مولانا نے پوچھا، کیا گناہ ہو گیا ہے؟ کہنے لگے، حضور! میں ہوٹل سے کھانا کھا کر جارہا تھا کہ راستے میں ایک چھپر (پھوس کا چھت) ملا۔ میں نے اس کے مالک سے اجازت لئے بغیر اس میں سے دانت کریدنے کیلئے ایک تنکا توڑ لیا۔ مولانا نے فرمایا۔ آپ بے فکر رہئے یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ کوئی تقوی کے خلاف نہیں ہے۔ لیکن مولانا فرمانے لگے کہ اسکی بات میرے دل کو نہیں لگی کہ واقعی اتنا بڑا متقی ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر ایک تنکا بھی چھونے کو گناہ سمجھتا ہے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ شاید یہ بناوٹ کر رہا ہے۔ فرمایا کہ ایک ہفتہ کے بعد یہ پتہ چلا کہ وہی آدمی جو چھپر (چھت) میں سے تنکا توڑ کر کانپ رہا تھا کہ گناہ ہو گیا جس کے پاس سے دودھ لیتا تھا اس کے پیسے لیکر بھاگ گیا۔

تقویٰ کی حقیقت میرے دوستو! آجکل کے لوگوں کا جو تقویٰ ہے وہ یہی ہے کہ نمازیں تو بہت پڑھیں گے۔ ہمیشہ نوافل میں مشغول رہیں گے۔ تلاوت بہت کریں گے لیکن قدم قدم پر انسانوں کے حقوق پامال کرتے پھریں گے۔ آپ کسی جگہ بیٹھ کر زور زور سے قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں، پاس ہی ایک مریض لیٹا ہوا ہے، آپ اتنی زور سے تلاوت کر رہے ہیں کہ آپ کی آواز سے اس کو تکلیف ہو رہی ہے، آپ تو یہ سمجھ

رہے ہیں کہ عبادت کر رہا ہوں اور اللہ کے یہاں یہ عبادت کی فہرست میں لکھی جارہی ہے۔ لیکن نہیں! یہ انسانوں کی حق تلفی میں لکھی جارہی ہے۔ ہاں! اگر آپ آہستہ تلاوت کرتے جس سے مریض کو تکلیف نہ پہنچتی تب تو یقیناً یہ عبادت ہوتی۔

میرے دوستو! جس دن ہمارے اندر یہ فکر پیدا ہو جائے گا میں سمجھتا ہوں کہ اس دن ہم صحیح معنی میں مسلمان اور متقی ہو جائیں گے۔ بعض دوست مجھ سے کہا کرتے ہیں کہ کوئی نصیحت کیجئے تو میں ہمیشہ ان سے یہی کہا کرتا ہوں کہ ہر وقت تم اس بات کا خیال رکھو کہ مجھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ بس! خدا کی قسم! اس سے بڑھ کر کوئی تقویٰ نہیں ہے۔ اگر آپ کسی مجمع میں بیٹھے ہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ آپ کسی کے آگے بیٹھ جائیں، آپکی پیٹھ کسی کے سامنے ہو جائے۔ اسکی تو اجازت ہے۔ لیکن اسکا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کسی کو ایذاء نہ پہنچے۔

کامل مسلمان کی نشانی

حدیث میں آتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده (۱)

کامل درجہ کا مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے کسی کو ایذا اور تکلیف نہ پہنچے۔ یہ ہے کامل درجہ کے مسلمان کی علامت! صرف نفلی عبادتوں سے انسان کامل درجہ کا مسلمان نہیں بنتا ہے۔ اسد ملتانی مرحوم نے شاید اسی حدیث کا ترجمہ کیا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے بالکل اسلامی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ فرمایا کہ

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری
کہ آشیاں شاخِ چمن پر بار نہ ہو

ہم نے ساری زندگی گھونسلے اس لئے نہیں بنائے کہ جس ڈالی پر تنکے رکھیں گے اس ڈالی پر وہ تنکے بوجھ بن جائیں گے، تمام عمر ہم نے بلا گھونسلہ کے تکلیف اٹھانا

(۱) بخاری / ۹، مسلم / ۵۰، نسائی / ۴۹۱۰

پسند کرلیا لیکن کسی ڈالی اور کسی شاخ پر بوجھ بننا پسند نہیں کیا۔ یہ ہے مؤمن کی نشانی؛ لہذا اگر کامل مؤمن بننا چاہتے ہو تو اپنے رشتہ داروں پر بوجھ نہ بنو، اپنے دوستوں پر بوجھ نہ بنو، اپنے پڑوسیوں پر بوجھ نہ بنو۔ لوگوں کے ساتھ برتاؤ ایسا ہونا چاہیے کہ تمہیں دیکھ کر انکا دل خوش ہوجائے، تمہاری وجہ سے کسی کا دل رنجیدہ نہ ہو۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی معافی خیر؛ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حقوق العباد کی بڑی اہمیت ہے، حقوق العباد کی حفاظت کرنے والے ہی دراصل متقی اور پرہیز گار ہیں۔ کیونکہ یہ توبہ کے باوجود معاف نہیں ہوتے۔ البتہ وہ حقوق اللہ کہ جنکی ادائیگی کی کوئی شکل نہیں ہے، جنکا کوئی کفارہ نہیں ہے، وہ توبہ سے معاف ہوجاتے ہیں مثلاً کسی نے شراب پی لی، اس نے اللہ کے حق کے خلاف کیا مگر اسکی ادائیگی کی کوئی شکل نہیں ہے۔ اب اگر وہ شخص توبہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے۔ اور وہ حقوق اللہ کہ جنکی ادائیگی کی متبادل شکل شریعت نے تجویز کردی ہے وہ ادائیگی کے بغیر معاف نہیں ہوتے۔ مثلاً آپ کی نماز قضا ہوگئی تو اس کا طریقہ نماز کو کسی طرح ادا کرنا ہے۔ اور اگر زندگی میں وقت نہ ملے تو اسکا بھی بہت آسان طریقہ ہے۔

جہالت کی انتہا، مثال کے طور پر آپ کی عمر ساٹھ (۶۰) سال کی ہوگئی ہے اور آپ کو یہ معلوم ہے کہ میری بیس (۲۰) سال کی نمازیں قضا ہوگئی ہیں تو قضا، عمری کرلیں۔ بعض یار لوگوں نے تو بڑا آسان سانسخہ تجویز کرلیا ہے، وہ لوگ یہ بتاتے ہیں کہ ارے بھائی؛ دو رکعت نماز قضاء عمری کی نیت سے پڑھ لو بیس (۲۰) سال کی نمازیں معاف ہوجائیں گی۔ میں نے کہا، بھائی؛ اسلام میں ایسی کوئی نماز قضاء عمری کے نام سے نہیں ہے۔ جو بیس سال کی نمازیں معاف کردے۔ اسی طرح میمن خاندان کے بعض لوگوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ صاحب؛ اب تک ہم اس غلط فہمی میں تھے کہ جب ہم نے ایک رقم پر زکوۃ ادا کردی تو وہ رقم تو پاس ہوگئی اس لئے اسکو الگ کرکے رکھ لیا، اب اگلے سال جو

زکوۃ دیں گے تو اس رقم پر نہیں دیں گے کیونکہ وہ رقم پاس ہو گئی ہے اب دوسری رقم پر زکوۃ دیں گے۔ میں نے کہا بھائی! یہ نسخہ تمہیں کس نے بتادیا؟ یہ تو غلط ہے! بلکہ ہر سال پوری کی پوری رقم پر زکوۃ دینا واجب ہے۔

قضائے عمری کا طریقہ تو میں قضاء عمری کے متعلق عرض کر رہا تھا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری عمر ساٹھ (۶۰) سال کی ہو گئی ہے اور بیس (۲۰) سال کی نمازیں مجھ پر واجب الادا ہیں۔ تو اسکا آسان اور بہترین نسخہ یہ ہے کہ اگر آپ یہ معمول بنالیں کہ ہر نماز کے ساتھ ایک قضاء نماز ادا کرلیں۔ آپ نے آج کی فجر کی نماز پڑھی اس کے ساتھ ساتھ دو رکعت اور پڑھ لیں اس نیت سے کہ میرے ذمہ جو سب سے پہلے فجر کی نماز ہے اسکی قضاء کر رہا ہوں۔ اسی طرح ظہر کے ساتھ ظہر، عصر کے ساتھ عصر، مغرب کے ساتھ مغرب اور عشاء کے ساتھ عشاء کی نماز قضاء پڑھ لیں ایک دن میں آپ کی پانچ نمازیں ادا ہو گئیں اور معاملہ ہے بیس سال کا۔ علماء نے لکھا ہے کہ آج سے آپ کمر باندھ لیجئے کہ میں نے جو سلسلہ شروع کیا ہے یہ بیس سال کی نمازوں کی ادائیگی کی نیت سے شروع کیا ہے اور اسے آخر تک پہنچانا ہے۔ اب اگر خدا نخواستہ دو (۲) چار (۴) سال میں ہی آپ کا انتقال ہو جائے تو باقی نمازیں اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے، اس لئے کہ آپ نے تو پوری نمازیں ادا کرنے کا عزم کرلیا تھا لیکن قدرت کی طرف سے وقت ہی نہیں ملا۔

عزم مصمم پر ثواب مرتب ہوجاتا ہے معلوم ہوا کہ جب آدمی کسی نیکی کا عزم اور ارادہ کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ ثواب اسی پر عطا فرمادیتے ہیں، کسی نے حج کا ارادہ کیا۔ اور ٹکٹ لیکر جہاز میں بیٹھ گیا، اچانک جہاز میں وہ بیمار ہوا اور اسکا انتقال ہو گیا۔ اسکو حج کا پورا ثواب ملے گا۔ اس لئے کہ اُس بیچارے نے توحج کیلئے جتنا کرنا تھا وہ کرلیا تھا لیکن قدرت کو منظور نہیں تھا اس لئے پہنچ نہیں سکا۔

یوم عاشورہ کے اعمال خیر! تو بات اس پر چل پڑی تھی کہ عاشورہ کا روزہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے ۔مگر یہ گناہ گناہ صغیرہ ہے۔ عاشورہ کی دوسری فضیلت یہ ہے کہ اس دن اپنے اپنے گھروں میں کھانا پکانے میں فراخ دلی اور وسعت سے کام لیں تاکہ غربا۔ ومساکین کو بھی دے سکیں اور گھر والوں کو بھی افراط کے ساتھ کھلا سکیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ عاشورہ کے دن اگر آپ اپنے اہل و عیال کے لئے کھانے میں وسعت کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کیلئے پورے سال کی روزی میں وسعت فرمائیں گے۔ یہ دو فضیلتیں ہوئیں۔

وصال نبی کے پچاس سال بعد پھر جب حضور اکرم ﷺ کے وصال کے پچاس (۵۰) سال گذرگئے تو اس کے بعد ۶۱ھ میں اسی دن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ چونکہ وقت کی کمی ہے اس لئے اس وقت مجھے واقعہ کی تفصیل عرض کرنا نہیں ہے مگر میں صرف اتنی سی بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی پوری تاریخ قربانیوں اور شہادتوں سے بھری پڑی ہے ۔اور ہمیں فخر ہے کہ ہماری تاریخ اسلام کیلئے مرمٹنے والوں کے خون سے رنگین ہے۔ اسی لئے علامہ اقبال نے تعریف کرتے ہوئے کہا ہے۔ فرمایا کہ ؎

غریب وسادہ ورنگیں ہے داستان حرم
نہایت اسکی حسینؓ ،ابتداء ہے اسماعیلؑ

اسلام سرفروشوں کا دین ہے یہ زنانوں کا دین نہیں ہے ،یہ چوڑیاں پہننے والوں کا دین نہیں ہے ،یہ اس قوم کا دین ہے کہ جو اپنے ناموس اور اپنی عزت کی حفاظت کیلئے ،اپنی شریعت کی حفاظت کیلئے خاک وخون سے کھیلتے ہیں ،ہمیں شہداء کربلا کی قربانیوں کے اوپر فخر ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اسلام کے ایک اصول کی حفاظت کیلئے ،دین کے ایک اصول کی حفاظت کیلئے عظیم الشان قربانی دی ہے آج

ہماری یہ حالت ہے کہ اگر ہمیں کوئی گالی دے دے تو ہم لڑنے مرنے کو تیار ہوجاتے ہیں اگر ہم سے کوئی پیسے چھین لے یا پیسہ لیکر نہ دے تو ہم اس طرح مرنے مارنے کو تیار ہوجاتے ہیں کہ بندوقیں بھی نکل جاتی ہیں کہ آج یوم جہاد ہے۔لیکن جب ہم اپنی آنکھوں سے یہ دیکھتے ہیں کہ شریعت کو ذبح کیا جارہا ہے۔دین کو ذبح کیا جارہا ہے۔سنت رسول ؐ کو مٹایا جارہا ہے تو معاف کیجئے گا ہم اور آپ یہ کہتے ہوئے آنکھیں چرُاکر گذر جاتے ہیں کہ یہ کام مولوی صاحب کا ہے۔ ہمارا نہیں ہے۔چلو گھر چلتے ہیں۔

حضرت حسینؓ نے جہاد کیوں کیا؟ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے صرف اس بنیاد پر جہاد کیا کہ اسلام نے جو نظام حکومت ہمیں دیا ہے اسمیں سربراہ مملکت اور حاکم مسلمانوں کی رائے اور مشورہ سے آتا ہے وراثت کے طور پر نہیں آتا۔ وراثت کا طریقہ قیصر وکسریٰ کا طریقہ ہے۔یہودیوں اور نصرانیوں کا طریقہ ہے۔ اور حضور اکرم ﷺ نے جو دین ہمیں دیا ہے اس کی ہر بات یہود ونصاریٰ سے الگ ہے۔ مشرکین سے الگ ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں ہے لیکن اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوجائیگا۔

مسلمان اور یہودی کی نماز میں فرق مثلاً نماز یہودی بھی پڑھتے ہیں اور مسلمان بھی پڑھتے ہیں لیکن دونوں کی نمازوں میں بہت فرق ہے۔یہودیوں کی نماز میں امام بالکل الگ کھڑا ہوتا ہے اس کیلئے سامنے بالکل الگ ایک کمرہ سا بنادیتے ہیں وہ وہاں پر کھڑا ہوتا ہے اور پیچھے الگ سے مقتدی کھڑے ہوتے ہیں۔ اسلام میں اس طریقے سے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔امام کو ایسی جگہ پر کھڑا ہونا چاہیئے کہ جہاں سے دائیں بائیں کے نمازی امام کو دیکھ سکیں۔

جسکا مطلب یہ ہے کہ نماز کے اندر بھی یہود کا طریقہ اور ہے۔مسلمانوں کا طریقہ اور ہے۔اور مشرکوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جیسے ہی آفتاب نکلا سجدہ کیا۔

آفتاب غروب ہوا سجدہ کیا، زوال کا وقت آیا سجدہ کیا۔ اسلام نے کہا کہ ان تینوں وقتوں میں سجدہ حرام ہے۔ ان تینوں اوقات میں ہمارے یہاں سجدہ اس لئے حرام قرار دیا گیا تاکہ مشرکوں کے ساتھ مشابہت پیدا نہ ہو۔

واقعہ کربلا منظر، پس منظر حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب یہ دیکھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے یزید بن معاویہ کے ہاتھ میں زمام حکومت دیا جارہا ہے یعنی باپ کے بعد بیٹے کو حاکم بنایا جارہا ہے تو فرمایا کہ میرے نانا جان جو دین کی امانت چھوڑ کر گئے ہیں اسکی حفاظت کیلئے میں اپنی جان دے سکتا ہوں مگر نانا جان کے دین اور اور انکی سنت کو مٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ وہ بہتر (۷۲) جاں نثاروں کو لیکر جو جہاد کیلئے تشریف لے گئے اس کا مقصد یہی تھا۔

حضرت حسینؓ کا پیغام مسلمانوں کے نام جسکا مطلب یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے خاک وخون میں تڑپ کر اپنا سر اپنے جسم سے جدا کروا کر قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ اے مسلمانو! اللہ کے دین کی حفاظت کا یہی طریقہ ہے جو میں نے خاک وخون میں تڑپ کر تمہیں دکھادیا ہے، اور جب مسلمان دین کی حفاظت کیلئے قربانی دیتا ہے تو پھر دین کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی ہے۔ اللہ کا دین فروغ پاتا ہے اور اللہ کے دین کو شوکت حاصل ہوتی ہے۔

غرضیکہ حضرت حسین اور شہدائے کربلا رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسلام اور اس کے اصول کی حفاظت کی خاطر قربانی دی تھی۔ آج ان کے نشانات ہمیں دین کی حفاظت کا سبق دے رہے ہیں ؎

قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دارا بھی گیسوئے دجلہ وفرات

آیئے ہم سب ملکر ان کیلئے دعا کریں کہ اے اللہ! شہداء کربلا کو کروٹ کروٹ

جنت عطا فرما۔ اے اللہ! ان کو آخرت کا اعلیٰ سے اعلیٰ چین اور اعلیٰ سے اعلیٰ سکون عطا فرما۔ اے اللہ! مسلمانوں کو اسوہ حسینی پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! ان کے طریقہ پر ہمیں چلنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا

اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ

سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون

وسلام علی المرسلین

والحمد للہ رب العلمین



معرکہ حق باطل

علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب اللہ نے اس کائنات کو پیدا کیا تو زمین کا کوئی چپہ بنجر نہیں تھا۔ زمین کا کوئی چپہ کھارا نہیں تھا کہ جس میں دھان نہ اگے۔ جس میں کوئی پیداوار نہ ہو۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ روئے زمین پر کوئی درخت ایسا نہیں تھا جو پھلدار نہ ہو اور یہاں تک لکھا ہے کہ سمندر کا پانی بھی میٹھا تھا۔ لیکن فرمایا کہ جب دنیا میں انسان نے سب سے پہلا گناہ کیا، بس اس گناہ کا ہونا تھا کہ اور بھی گناہ ہوتے چلے گئے۔ اور جوں جوں انسانوں کے گناہ بڑھتے چلے گئے زمین بنجر ہوتی چلی گئی اور زمین سے ایسے درخت پیدا ہونے لگے کہ جس میں پھل نہیں کانٹے ہوتے ہیں، یہاں تک کہ سمندر کا پانی بھی کڑوا ہو گیا۔





اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ

وَاَصْحٰبِهٖ اَجْمَعِيْنَ

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ لَئِنْ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ اِنِّيْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

سورۃ المائدۃ

صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيْمِ وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

تمہید بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز جب اسلامی سنہ اور اسلامی سال شروع ہوتا ہے اور محرم الحرام کا مہینہ آتا ہے تو تقریباً ہیں، پچیس سال سے آپ کے یہاں پورے دس دن جلسے اور اجتماعات منعقد ہوتے ہیں تاکہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اور ان کی عظیم قربانی پر خراج عقیدت پیش کریں۔

چونکہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا تعلق کسی ایک گروہ یا کسی طبقہ سے نہیں ہے، وہ سرکار دوعالم ﷺ کے لخت جگر اور آپ ﷺ کے نواسے ہیں اس لئے روئے زمین کا کوئی کلمہ گو مسلمان ایسا نہیں ہوگا جس کے دل میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اور ان کی قربانی کا احترام نہ ہو۔ اس لئے ان جلسوں سے ایک طرف تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم ان کی شہادت عظمیٰ پر خراج عقیدت اور خراج تحسین پیش کریں اور دوسری طرف یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ ہم اس واقعہ سے سبق حاصل کریں۔

دنیا کی ہر شئی میں انسان کے لئے رہنمائی ہے اس لئے کہ دنیا میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے کہ جس سے انسانوں کو سبق نہ ملے چاہے وہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ ہو چاہے وہ کوئی اہم واقعہ ہو۔ سبق حاصل کرنے والے ہر اس چیز سے سبق حاصل کر لیتے ہیں جو ان کے آنکھوں کے سامنے ہو۔ آپ نے دیکھا کہ جب آپ پتھر، لوہا وغیرہ دریا میں ڈالتے ہیں، سمندر میں ڈالتے ہیں تو فوراً وہ تلی (تہہ) میں بیٹھ جاتا ہے۔ ڈوب جاتا ہے لیکن اگر آپ اس سے زیادہ بھاری لکڑی کے تختے اور درختوں کے تنے ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ نہیں ڈوبے گا بلکہ تیرتا رہے گا۔ اللہ کا ایک عارف بندہ کہتا ہے کہ کیا تم نے اس پر کبھی غور کیا ہے کہ کیا معاملہ ہے؟ یہ بھی ہمیں سبق دیتا ہے۔ فرمایا کہ ؎

چوب را آب فرو نہ برد حکمت چیست؟
شرم دارد زفرو بردن پروردہ خویش!

پانی جو لکڑی کو نہیں ڈبوتا ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ پانی کو شرم آتی ہے کہ لکڑی کا وجود تو میرے وجود کے ذریعہ ہوا ہے۔ میں نے اس کو تنا اور درخت بنایا ہے۔ میں نے اس کو لکڑی بنایا ہے اور جس کو خود میں نے پالا ہے اس کو ڈبوتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ اس لئے پانی لکڑی کو نہیں ڈبوتا۔ کتنا اعلیٰ سبق اس سے ملا۔ فرمایا کہ ؎

چوب را آب فرو نہ برد حکمت چیست؟
شرم دارد زفرو بردن پروردہ خویش!

خنزیر سے انسان کو کیا سبق ملتا ہے؟ تو میں نے یہ عرض کیا کہ ہر چیز سے سبق حاصل ہوتا ہے۔ خلفائے بنو عباسیہ کے زمانے میں ایک خلیفہ نے بعض اہل دانش اور علماء سے یہ سوال کیا کہ آپ کہتے ہیں کہ ہم نے ہر چیز سے سبق حاصل کیا ہے اور ہر چیز ہم کو سبق دیتی ہے تو یہ بتایئے کہ خنزیر سے آپ نے کیا سبق حاصل کیا؟ یہ جانور نجس عین ہے، سب جانوروں سے زیادہ گندہ اور غلیظ ہے، اسلام میں اس جانور سے سب سے

زیادہ نفرت کی گئی ہے۔ اسے حرام قرار دیا گیا ہے۔ کیا اس سے بھی آپ نے کوئی سبق حاصل کی ہے؟ انہوں نے کہا ہاں، ہم نے اس جانور سے بھی سبق حاصل کیا ہے۔ اس جانور سے ہم نے یہ سبق حاصل کیا ہے کہ نیند سے علی الصبح بیدار ہو جاؤ، کیونکہ یہ جانور انسانوں کی غلاظت اور گندگی کھاتا ہے اس لئے یہ بہت سویرے اٹھنے کا عادی ہے، اگر یہ سویرے نہ اٹھے تو اپنی خوراک اور اپنی غذا سے محروم ہو جائے گا۔ اس سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ جب یہ جانور اتنا سویرے اٹھتا ہے اور اس کی خوراک اور غذا ہماری غلاظت میں ہے تو ہمیں اس سے بھی جلدی اٹھنا چاہئے۔

جب دنیا کے ہر واقعہ سے خواہ وہ چھوٹا ہو خواہ وہ بڑا ہو سبق حاصل ہوتا ہے تو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت عظمیٰ اور تاریخ اسلام کے اس نادر واقعہ سے مسلمانوں کو سبق حاصل نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس واقعہ کے اندر بھی ہمارے اور آپ کیلئے بڑی بڑی عبرتیں، بڑے بڑے اسباق اور بڑی بڑی نصیحتیں ہیں۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی ہوتی

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ کے اس محلہ میں تقریباً بیس پچیس سال سے جلسے اور اجتماعات کا یہ طریقہ چلا آرہا ہے اور اس کے منتظمین مجھے بھی تقریباً ہر سال دعوت دیتے رہے ہیں اور میں حاضر ہوتا رہا ہوں مگر سال گذشتہ میں حاضر نہ ہو سکا۔ ایک صاحب نے مجھے اسکی یاد دلائی۔ مجھے پوری بات تو یاد نہیں ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس میں صرف میری طرف سے کوتاہی نہیں ہوئی تھی بلکہ بعض منتظمین نے آکر جب یہ بات کہی کہ فلاں فلاں تاریخیں ملنی چاہئیں تو میں نے کہا، آپ حضرات دیر سے آئے ہیں، یہ تاریخیں میں پشاور والوں دے چکا ہوں اس لئے میں ان تاریخوں میں نہیں آسکتا۔ کوئی اور تاریخ رکھیں میں آتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ پورے عشرہ کا پروگرام ہم بنا چکے ہیں۔ میں نے کہا۔ ٹھیک ہے جب آپ پروگرام بنا چکے ہیں تو اس مرتبہ میری حاضری نہیں ہوئی انشاء اللہ آئندہ سال سے دیکھا

جائے گا۔ تو کوتاہی صرف میری طرف سے ہی نہیں تھی اس میں کچھ منتظمین حضرات کی بھی بات تھی۔

بہرحال ؛ گذشتہ سال میں حاضر نہیں ہوسکا اس سال جب دوستوں نے درخواست کی تو میں معمول کے مطابق حاضر ہوگیا۔ اور جیسا کہ معمول ہے کہ اس عشرہ میں دو دن میرے لئے رکھے جاتے ہیں۔ آج بھی اور آنے والے کل بھی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ ان دونوں راتوں کے اندر اور ان دونوں مجلسوں کے اندر اللہ تعالیٰ مجھے حق بات کہنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں اور آپ کو سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

یوم عاشورہ میں جلسہ کیوں کرتے ہیں ؟ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ان جلسوں سے ہمارے دو مقصد ہیں ایک حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت عظمیٰ پر خراج عقیدت اور نذرانہ عقیدت پیش کرنا اور دوسرے اس سے سبق حاصل کرنا۔ اس کیلئے سب سے پہلے ہم اور آپ اس بات پر غور کریں کہ اس دنیا میں اور اس کائنات میں صرف ایک طرح کی مخلوق نہیں ہے، اس میں رنگا رنگ اور مختلف قسم کی مخلوقات ہیں ؛ بالکل اسی طریقہ سے کہ جس طرح کسی چمن اور کسی باغ میں صرف ایک رنگ کا پھول نہیں ہوتا ہزاروں رنگ کے پھول ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ

گلہائے رنگارنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق ! اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

کائنات میں مختلف صفتوں کی مخلوقات ہیں اللہ تعالیٰ نے مختلف مخلوقات پیدا فرمائیں، ان میں کچھ ایسی مخلوق بھی ہے جو خالص خیر ہی خیر ہے اس میں شر کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے اور بعض مخلوقات ایسی ہیں کہ جو سرتاپا شر ہی شر ہیں، ان میں خیر کا کوئی پہلو نہیں ہے اور بعض مخلوقات ایسی ہیں کہ جن میں دونوں پہلو موجود ہیں۔ آپ چاہیں تو انہیں خیر بنادیں اور آپ چاہیں تو انہیں شر بنادیں۔ وہ مخلوق جو خالص خیر ہیں

وہ ملائکۃ اللہ اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں اور وہ مخلوق جو خالص شر ہیں جن میں خیر کا کوئی پہلو نہیں ہے وہ ابلیس و شیاطین ہیں۔ ان دونوں قسم کے مخلوق کے علاوہ وہ جتنی بھی مخلوقات ہیں ان کے اندر خیر کا پہلو بھی ہے، شر کا پہلو بھی ہے۔ یہ ہمارے اور آپ کے رویے کے اوپر ہے کہ ہم انہیں خیر بناتے ہیں یا شر بناتے ہیں۔

مال میں خیر و شر دونوں پہلو پایا جاتا ہے

مثلاً دولت:- یہ خیر بھی ہے شر بھی ہے۔ حدیث میں آتا ہے "نعم المال الصالح للرجل الصالح۔ (۱)۔ مال اپنی جگہ ایسا ہے جیسا بے رنگ پانی؛ جس میں کوئی رنگ نہیں ہے۔ لہٰذا اگر یہ دیکھو کہ اگر یہ نیک آدمی کے پاس ہے تو یہ مال بھی نیک ہے اور اگر یہ برے آدمی کے پاس ہے تو یہ مال بھی برا ہے۔ اگر کوئی اس کو نیکی میں خرچ کررہا ہے تو یہ مال بھی نیک ہے اور اگر برائی میں خرچ کررہا ہے۔ معصیت اور نافرمانی میں خرچ کررہا ہے تو یہ خیر نہیں، شر ہے۔ تو سکہ وہی ہے، نوٹ وہی ہے، سونا وہی ہے مگر ان کی حیثیت اور استعمال میں فرق ہے۔

ایک نواب صاحب اور بنیا کی دلچسپ کہانی

ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک نواب صاحب تھے۔ اور وہ بڑے طمطراق اور بڑے شان و شوکت کے نواب تھے، ہمیشہ ان کے ساتھ نوکر چاکر، حشم خدم رہتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ سمندری جہاز میں کہیں جارہے تھے، ان کے ساتھ ایک بنیا بھی سفر کررہا تھا۔ وہ بنیا بہت بڑا دولت مند تھا اور اس کی آمدنی نواب صاحب سے تقریباً آٹھ گنی زیادہ تھی، لیکن پورے جہاز میں نہ کوئی اسے پوچھنے والا تھا نہ کوئی سلام کرنے والا تھا۔ کوئی جاننے والا نہیں تھا، بنیا یہ سوچنے لگا کہ دولت میرے پاس زیادہ ہے، پیسہ میرے پاس زیادہ ہے اور اس نواب صاحب کی آمدنی مجھ سے بہت کم ہے لیکن مجھے تو کوئی سلام بھی نہیں کرتا ہے اور نواب صاحب کی

(۱) مشکوۃ ص / ۳۲۶

اتنی شان وشوکت ہورہی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

قارون جب زمین میں دھنس رہا تھا تو

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ دولت کے ذریعہ یا کسی کو سونا چاندی دے کر کسی کی عزت نہیں ہوتی۔ اگر دولت کی وجہ سے کسی کی عزت ہوا کرتی تو دنیا میں سب سے زیادہ مقبول اور باعزت انسان قارون ہوتا۔ لیکن قارون کا ساتھ دینے والا اور اس کی عزت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ جب وہ اپنے خزانے کے ساتھ زمین میں دھنس رہا تھا تو لوگوں سے کیا کہا؟ لوگوں نے یہ کہا کہ اے اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے ہمیں قارون نہیں بنایا ورنہ ہمارا بھی یہی حشر ہوتا جو اس کا ہو رہا ہے۔

دہلی کا آنکھوں دیکھا حال

اور یہ واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ دہلی میں جس زمانے میں ٹرام (Tram) چلتی تھی۔ جیسے یہاں بھی ٹرام چلتی تھی۔ اس میں بیٹھنے کی سیٹیں لمبی لمبی ہوتی تھی۔ میں ٹرام میں بیٹھا ہوا تھا کہ دیکھا، ایک مارواڑی ہندو جو گلے میں سونا پہن رکھا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی بہت بڑا دولت مند ہے، وہ ایک سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن سیدھا نہیں بیٹھا ہوا تھا ترچھا بیٹھا ہوا تھا۔ ایک صاحب ٹرام میں چڑھے اور چڑھ کر انہوں نے جگہ تلاش کرنے کیلئے ادھر ادھر دیکھا۔ جب ان کی نظر اس مارواڑی پر پڑی تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ یہ جو ٹیڑھا بیٹھا ہوا ہے اگر سیدھا بیٹھ جائے تو جگہ ہو جائے گی، چنانچہ انہوں نے اس مارواڑی سے کہا کہ بھائی! ذرا تو سیدھا ہو کر بیٹھا جا، اس نے کہا: نہیں! یہاں پر جگہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا، اچھا! پھر میں نے خود دیکھا کہ وہ مسافر تھوڑی سی جگہ میں بیٹھا گیا اور بیٹھ کر اتنا زور سے دھکا دیا کہ وہ مارواڑی نیچے گر گیا، پھر اس نے کہا، اب جگہ ہو گئی حالانکہ اس نے بھی یہ دیکھا تھا کہ اس مارواڑی کے پاس سونے کے زیورات ہیں، یہ دولت مند آدمی ہے مگر کوئی ڈر نہیں تھا اس کے دل میں۔

بنیا کی پریشانی تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ بنیا کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ بھائی! پیسہ تو میرے پاس بھی وہی ہے اور نواب صاحب کے پاس بھی وہی ہے بلکہ میرے پاس نواب صاحب سے زیادہ دولت ہے پھر نواب صاحب میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے کہ جس کو دیکھو ادھر ہی چلا جا رہا ہے؟ بنیا نے موقعہ تلاش کر کے نواب صاحب سے بات کی اور یہ کہا کہ نواب صاحب! ذرا یہ بتایئے کہ جو دولت آپ کے پاس ہے وہی دولت میرے پاس بھی ہے بلکہ میرے پاس زیادہ دولت ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ مجھے کوئی نہیں پوچھ رہا ہے اور آپ کے سامنے سب دست بستہ کھڑے ہیں؟ کیا دولت، دولت میں بھی کوئی فرق ہوتا ہے؟ کیا روپیہ روپیہ میں بھی کوئی فرق ہوتا ہے؟ نواب صاحب نے کہا کہ لالہ جی! آپ کو معلوم نہیں ہے! دراصل دولت، دولت میں فرق ہوتا ہے۔ روپیہ پیسہ تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن ہاتھ، ہاتھ کا فرق ہوتا ہے۔ میرے ہاتھ میں ہے تو اس کی تاثیر اور ہے اور آپ کے ہاتھ میں ہے تو اس کی تاثیر اور ہے۔ بنیا نے کہا: نواب صاحب! میں تو آپ کی یہ بات ماننے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ نواب صاحب نے کہا، اچھا! اگر تم نہیں مانتے ہو تو میں تمہیں تجربہ کرا دیتا ہوں۔ چنانچہ نواب صاحب نے بنیا کی دعوت کی۔ بنیا کھانا کھانے کیلئے آیا لیکن اسے کچھ نہیں معلوم کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ بنیا جب کھانا وغیرہ سے فارغ ہو گیا تو وہ جو ملازمین نواب صاحب کے آداب بجانے کیلئے چاروں طرف دست بستہ کھڑے تھے، نواب صاحب نے ان سے کہا کہ دیکھو! لالہ جی کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔ بس اتنا کہنا تھا کہ سارے ملازمین نے گنڈا ڈولی کر کے لالہ جی کو دروازہ سے باہر اٹھا کر پھینک دیا۔ یہ بڑا شرمندہ ہوا اور کہنے لگا کہ نواب صاحب! یہی تجربہ آپ نے کرایا؟ یہ تو کوئی تجربہ نہیں ہے! یہ میں بھی آپ کے ساتھ کر سکتا ہوں!

نواب صاحب کی شوخی نواب صاحب نے کہا: لالہ جی! آپ ایسا نہیں کر سکتے!

انہوں نے کہا، اچھا! کل ہمارے یہاں آپ کی دعوت ہے۔ نواب صاحب نے دعوت قبول کرلی۔ اب جو نواب صاحب کھانا کھانے کیلئے گئے تو دیکھا کہ وہاں پر حشم خدم نوکر چاکر بھی ان کے ساتھ کھڑے ہیں۔ نواب صاحب کھانا تھا چکے تو لالہ صاحب نے آواز دیکر کہا، آواز بھی برابر نہیں نکلی۔ لالہ جی نے نوکروں سے کہا کہ نواب صاحب کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔ تو نواب صاحب نے جو گھور کر دیکھا تو کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ کچھ کرسکے۔ وہ وہیں کے وہیں بیٹھے رہے۔ نواب صاحب نے کہا، لالہ جی! آپ نے دیکھ لیا کہ ہاتھ ہاتھ کا کیا فرق ہے؟ یہی دولت آپ کے پاس ہے تو بزدلی پیدا کرتی ہے اور یہی دولت میرے پاس ہے تو جرات پیدا کرتی ہے۔ تو پیسہ وہی ہے لیکن ہر جگہ اس کی تاثیر اور خاصیت الگ الگ ہے۔ تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ حدیث میں آتا ہے۔

"نعم المال الصالح للرجل الصالح"۔

حضرت عثمانؓ کا لقب غنی کیسے اور کیوں؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا لقب "غنی" ہے۔ غنی کے معنی ہیں صاحب ثروت اور صاحب دولت۔ لیکن مسلمان اس بات پر فخر نہیں کرتا کہ وہ صاحب دولت و ثروت ہے۔ ایک فرشتہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آکر یہ عرض کرتا ہے کہ اگر آپ اجازت دیں تو احد کے پہاڑ کو سونے کا بنا دیا جائے اور جہاں جہاں آپ جائیں آپ کی مالی ضرورت پوری کرنے کیلئے یہ پہاڑ آپ کے ساتھ ساتھ چلے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں دنیا میں سونے چاندی کے پہاڑ جمع کرنے کیلئے نہیں آیا ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک وقت کھانا کھاؤں اور دوسرے وقت فاقہ کروں تاکہ آنے والی امت کو یہ سبق یاد رہے۔ مگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو جو غنی کا لقب دیا گیا ہے وہ مال کے غنا کے اعتبار سے نہیں بلکہ دل کے غنا، کے اعتبار سے دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ جن کے ہاتھ میں پیسہ نہیں ہوتا ان میں سخاوت کا مادہ ہوتا ہے اور جن لوگوں کے اندر سخاوت کا مادہ

نہیں ہوتا ہے ان کی جیب میں پیسہ بہت ہوتا ہے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ علیہ نے کہا۔ فرمایا کہ ؎

کریماں را بدست اندر درم نیست
خداوندانِ نعمت را کرم نیست

جن کے دلوں میں سخاوت کا مادہ ہے ان کی جیب میں پیسہ نہیں ہے۔ان کا ہاتھ خالی ہے اور جن کے ہاتھ میں پیسہ موجود ہے وہ اس کو مَل مَل کر رکھتے ہیں، کسی کو دینا نہیں چاہتے۔ مگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی ساری دولت مسلمانوں کیلئے وقف تھی۔

جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں مسلمانوں کو خاص طور پر پانی کی دقت اور پانی کی تکلیف تھی۔ ایک یہودی کے پاس کنواں تھا آپؓ نے اسے پینتیس ہزار درہم میں خرید کر مسلمانوں کیلئے وقف کردیا(۱)۔

اندازہ لگائیے کہ پینتیس ہزار درہم میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس کنویں کو خریدا۔ آج اس پینتیس ہزار درہم کی کیا حیثیت ہوگی؟ کیونکہ آج سے چالیس پچاس سال پہلے ایک روپیہ کی جو حیثیت تھی معاف کیجئے آج وہ بیس روپیہ کی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روپیہ کا بیس سیر آٹا آیا کرتا تھا۔ ایک روپیہ کا آٹا منگا کر ایک کنبہ والا یہ سوچتا تھا کہ ایک مہینہ کا سرمایہ جمع ہوگیا، جب آج بیس چالیس سال میں اتنا فرق ہوگیا تو آج سے تیرہ سو سال پہلے پینتیس ہزار درہم کی حیثیت ایسی ہی رہی ہوگی جیسی آج پینتیس کروڑ کی ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنی جیب سے پینتیس ہزار درہم نکال کر کنواں خریدا اور مسلمانوں کیلئے وقف کردیا۔ غزوہ تبوک کے موقعہ پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس سے چھ سو اونٹ اور پچاس

(۱) ترمذی شریف ج ۲ / ۲۱۱

گھوڑے جہاد کیلئے دیتے۔ اور اس کے علاوہ ان کا معمول یہ تھا کہ صبح جب اٹھتے تھے تو اپنی دولت سے کسی غلام کو خریدتے تھے اور خرید کر اس کو آزاد کر دیتے تھے۔ غلاموں کی گلو خلاصی کیلئے وہ پیسہ خرچ کرتے تھے۔

تو بات یہ چل رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جب کائنات کو پیدا کیا تو اس کے اندر ایسی مخلوقات بھی پیدا کی جو خالص خیر ہیں اور ایسی مخلوقات بھی پیدا کی جو خالص شر ہیں اور ایسی مخلوقات بھی پیدا کی کہ جن میں دونوں حیثیتیں موجود ہیں۔ مثلاً اولاد، دولت، کرسی وغیرہ ان چیزوں کو آپ نعمت سمجھتے ہیں لیکن یاد رکھئے کہ ان میں ایک پہلو خیر کا بھی ہے اور ایک پہلو شر کا بھی ہے۔ یہ آپ کی ہوشیاری کے اوپر ہے کہ آپ ان میں سے خیر لے لیں اور شر سے بچ جائیں۔

مال سے متعلق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نظریہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قیصر و کسریٰ کے خزانے سونے، چاندی، ہیرے، جواہرات مسلمانوں کے قبضہ میں آئے جنہیں ایک میدان میں جمع کر دیا گیا۔ جسکا اتنا بڑا ڈھیر لگ گیا کہ ادھر کوئی آدمی کھڑا ہو جائے تو ادھر کے آدمی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس ڈھیر کے پاس آئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ فرمایا کہ اے اللہ! میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ ان چیزوں کی محبت میرے دل میں نہیں ہے۔ میں جھوٹ نہیں بولتا، میرے دل میں سونے چاندی، مال و دولت کی محبت ضرور ہے۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ میرے دل میں ان چیزوں کی محبت نہیں ہے وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

خواجہ عبید اللہ احرارؒ کی حکومت حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ بادشاہت بھی کرتے تھے، کچہری بھی لگاتے تھے اور ایک بڑے اللہ والے اور صاحب کشف بزرگ بھی تھے۔ ایک صاحب نے سوچا کہ یار! یہ کیسے بزرگ ہیں؟ یہ تو صبح سے لیکر شام تک دنیا میں پھنسے رہتے ہیں، ذرا چلو ان کا امتحان لیں۔ کیوں؟ کبھی کبھی

پرائمری (PRIMARY) درجہ کا پڑھنے والا طالب علم بھی کسی پی، ایچ، ڈی (P.H.D) کے طالب علم کے امتحان کی کوشش کرتا ہے اس لئے کہ اس نالائق کو یہ خبر نہیں ہے کہ اتنے بڑے ذی علم کا امتحان میں نہیں لے سکتا۔ اسی طرح یہ آدمی بھی آیا اور آ کر حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمہ اللہ علیہ سے کہنے لگا کہ حضرت! میرے دل میں یہ خواہش ہے کہ میں حج بیت اللہ کو جاؤ اور آپ بھی میرے ساتھ ہوں خواجہ عبید اللہ احرار رحمہ اللہ علیہ فوراً کھڑے ہوئے۔ اور سارا کام چھوڑ دیا اور فرمایا کہ بھائی! تم نے بڑا ارادہ کیا ہے، چلو ماشاء اللہ ابھی چلو! اب وہ حیران ہے، کہنے لگا کہ حضور! یہ جو سارا کا سارا کاروبار پھیلا ہوا ہے اس کا کام آپ نے کس پر چھوڑا ہے؟ فرمانے لگے کہ بھائی! نہیں اس کی کیا فکر ہے، جب میں دنیا میں نہیں تھا جب بھی یہ کاروبار چلتا تھا اور جب میں دنیا میں نہیں رہوں گا جب بھی یہ کاروبار چلے گا۔ یہ تم نے کیا فکر کی! یہ تو اللہ کا کام ہے وہ کسی سے لے لے گا۔ چلو بھی نکلو کہنے لگا حضور مجھے تھوڑا وقت دیجئے۔ کم از کم میں اپنے گھر سے ایک کمبل تو لیتے آؤں! حضرت خواجہ صاحب کو غصہ آ گیا، بڑے صاحب کشف بزرگ تھے، فرمانے لگے کہ تجھے شرم نہیں آتی۔ میں نے تو ساری سلطنت پر لات ماردی اور تو ایک کمبل چھوڑنے کے لئے بھی تیار نہیں ہے؟ تو میرا امتحان لیتا ہے؟

سیدنا فاروق اعظمؓ کا استدلال

حضرت فاروق اعظم رحمتہ اللہ علیہ خزانہ کے اس ڈھیر کے سامنے کھڑے ہو کر دعا مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ سونے چاندی کی محبت ہمارے دل میں ہے ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے، اس کا انکار کرنا قرآن کا انکار ہے کیونکہ قرآن کریم میں تو نے خود ہماری فطرت بیان کی ہے۔ فرمایا کہ:

زين للناس حب الشهوات من النساء

والبنين والقنٰطير المقنطرة من الذهب والفضة

ترجمہ:۔ خوشنما معلوم ہوتی ہے لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت (مثلاً) عورتیں ہوئیں، بیٹے ہوئے، لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے) (معارف القرآن)

چند چیزوں کی محبت اللہ تعالیٰ نے ہماری فطرت) میں رکھ دی ہے، اولاد کی محبت رکھ دی ہے، بیویوں کی محبت رکھدی ہے، سونے چاندی کی محبت رکھ دی ہے۔ اور جب خدا نے ہی ان چیزوں کی محبت ہماری فطرت میں رکھ دی ہے تو ہم اور آپ کیسے انکار کرسکتے ہیں؟ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کیسی حکیمانہ دعا مانگی! فرمایا کہ اے اللہ! ان چیزوں کی محبت تو میرے دل میں ہے لیکن میں یہ دعا مانگتا ہوں کہ اس خزانہ میں جتنا خیر ہو وہ مجھے مل جائے اور جتنا شر ہو اس سے ہمیں پناہ دے۔

کائنات حکمت خداوندی کا مظہر ہے تو میرے دوستو! میں یہ عرض کررہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کی مخلوقات پیدا فرمائی ہیں، حق بھی پیدا کیا باطل بھی پیدا کیا، خیر بھی پیدا کیا شر بھی پیدا کیا، دن بھی پیدا کیا اور رات بھی پیدا کیا۔ اس میں اللہ کی بڑی بڑی حکمتیں ہیں، دن کی روشنی کے ساتھ ساتھ رات کی ظلمت بھی پیدا کی ہے، نور ایمان کے ساتھ ساتھ کفر کی ظلمت بھی پیدا کی ہے بلکہ جب سے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اسی وقت سے کفر و ایمان بالکل دو جڑواں بچے کی طرح ساتھ ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ اور خدا کی حکمت اور اس کارخانۂ قدرت کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ صرف خیر پیدا نہ فرمائیں بلکہ ان چیزوں کو بھی پیدا فرمائیں کہ جن کو ہم شر کہتے ہیں۔

مثال سے سمجھئے میں آپ سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ اگر آپ ایک بہت شاندار قلعہ بنائیں، محل بنائیں، جیسا کہ کسی زمانہ میں یہ مشہور تھا کہ یہ آغا پیلس (PALACE) ہے، اسی طرح اگر آپ کوئی بہت بڑا پیلس بنائیں۔ اس میں آپ نے عبادت کی جگہ بھی رکھی، کھانے کی جگہ بھی رکھی، بیٹھنے کی جگہ بھی رکھی لیکن بیت الخلاء

نہیں بنایا کیونکہ آپ نے کہا کہ توبہ توبہ، یہ اتنا صاف ستھرا مکان ہے اس میں پاخانہ کا کیا کام؟ اس لئے آپ نے بیت الخلاء نہیں بنایا۔ اب ہر صاحب فن اسے دیکھ کر یہی کہے گا کہ اس محل کا نقشہ کسی اناڑی نے بنایا ہے۔ یہ محل تو بڑا خوبصورت ہے مگر مکمل نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس محل میں غسل خانہ بہت اچھا ہے، سونے کا کمرہ بہت اچھا ہے، بیٹھنے کا کمرہ بہت اچھا ہے، باورچی خانہ بہت اچھا ہے مگر اس میں بیت الخلاء نہیں ہے، اس محل کی تکمیل تو جب ہوتی جبکہ اس کے رہنے والے کی تمام ضرورتیں اسی میں پوری ہوتیں۔

اب آپ غور کریں کہ بیت الخلاء تو کوئی اچھی جگہ نہیں ہے لیکن اس کے نہ ہونے کی وجہ سے ایک اچھا اور شاندار محل بھی ناقص رہ جاتا ہے؛ اور اس زمانہ میں تو لوگوں نے اپنے کمروں کے اندر ایسے بیت الخلاء بنائے ہیں کہ بیچارہ ایک گاؤں والا کسی شہر والے کے یہاں آکر ٹھہر گیا۔ اس کو ضرورت محسوس ہوئی، اس نے بیت الخلاء کے کواڑ کھول کر دیکھا تو اس میں ٹائل (TILE) لگے ہوئے تھے، شیشے لگے ہوئے تھے۔ اس نے کہا، یہ اتنا خوبصورت کمرہ ہے، یہ بیت الخلاء نہیں ہوسکتا۔

ایک نکتہ دوسری بات ذرا غور سے سن لیجئے گا، وہ یہ کہ موجودہ تہذیب میں باپ دور، ماں دور، بھائی دور، بہن دور لیکن پاخانہ قریب! آپ کے کمرہ سے جس کو اٹاچ باتھ روم (ATTACH BATH ROOM) کہتے ہیں، سب سے زیادہ قریب بیت الخلاء ہے اور باپ کا کمرہ، ماں کا کمرہ اور دوسرے رشتہ دار اس سے بھی دور ہوگئے۔

تو میں نے یہ عرض کیا کہ بیت الخلاء تکمیل مکان کیلئے ضروری ہے حالانکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ بیت الخلاء کوئی اچھی جگہ نہیں ہے، کوئی وہاں آرام کرنے کیلئے نہیں جاتا چاہے کتنے ہی ٹائل لگادی گئی ہو۔ چاہے کتنے ہی شیشے لگادیئے گئے ہوں۔ ہر آدمی یہ کوشش کرتا ہے کہ اگر میں پانچ منٹ میں فارغ ہوتا ہوں تو ساڑھے چار منٹ میں ہی

فارغ ہو جاؤں۔

ملفوظات حضرت تھانویؒ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا بڑی حسین اور خوبصورت ہے مگر اس کے باوجود مومن کا دل یہاں نہیں لگتا اور اس لئے نہیں لگتا کہ جس طریقہ سے ایک قیدی قید خانہ میں رہے اور آپ اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کا محل دے دیں مگر وہ یہی کہے گا کہ بابا! اس محل میں میں اتنی ہی دیر رہ سکتا ہوں جتنی دیر بیت الخلاء میں جاکر گذارتا ہوں۔ یہ آرام کی جگہ نہیں ہے۔ جتنی جلدی ہوسکے یہاں سے فارغ ہو کر فوراً بھاگوں۔ اسی طرح مومن کا دل یہ کہتا ہے کہ یہ دنیا ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے۔ قیام کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ بس! یہاں جو وقت گذارنا ہے گذارو اور چلو! فرمایا کہ

دربزم دور یک دو قدح درکش و برو   یعنی طمع مدار وصال دوام را

زبان کو سنبھالئے تو میرے دوستو! جس طرح مکان میں اچھے کمرے بھی ہیں برے کمرے بھی ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں خیر بھی پیدا کیا ہے اور شر بھی پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ فرشتوں کا بھی خالق ہے پیغمبروں کا بھی خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر نیکی کا خالق بھی ہے، ہر شر کا خالق بھی ہے۔ مگر حقیقت اور چیز ہے اور اس کا اظہار اور چیز ہے اس لئے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ وہ سچی ہیں مگر اس کے کہنے کی اجازت نہیں ہے مثلاً اگر کسی کا باپ نابینا ہو اور وہ اپنے باپ سے یہ کہے کہ اے نابینا صاحب! تو باپ ناراض ہو جائے گا۔ اب اگر بیٹا یہ کہے کہ خدا کی قسم میں نے سچی بات کہی ہے، محلہ والوں سے پوچھ لو میں نے کوئی جھوٹ بات تو نہیں کہی ہے؟ تو وہ یہی کہیں گے کہ بات تو سچی ہے لیکن ایک بیٹے کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے باپ کو نابینا اور اندھا کہہ کر پکارے۔ یہ تہذیب کے خلاف ہے۔

اسی طرح اللہ خیر کا خالق بھی ہے، شر کا خالق بھی ہے مگر اللہ کو خالقِ شر کہنا جائز

نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ خالق ابلیس و شیطان ہے۔ اللہ تعالیٰ شراب کا خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ خنزیر کا خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ گدھے کا خالق ہے جائز نہیں ہے۔ آپ کہیں گے کہ کیوں صاحب! کیا یہ چیزیں اللہ کے سوا کسی اور نے پیدا کی ہیں؟ نہیں! اللہ ہی نے پیدا کی ہیں! مگر ساری مخلوقات کے بارے میں اگر آپ یہ کہیں کہ ساری مخلوقات کا خالق اللہ ہے خواہ وہ خیر ہو خواہ وہ شر ہو تو یہ جائز ہے۔ لیکن اگر آپ صرف شر کا نام لے لے کر یہ کہیں کہ اللہ خالق خنزیر ہے۔ خالق ابلیس و شیطان ہے۔ خالق شراب ہے تو یہ جائز نہیں ہے۔ یہ اللہ کی توہین ہے۔

کبھی ایسے بھی سوچئے آپ مکان بناتے ہیں اور جب کوئی مہمان اس کو دیکھنے کیلئے آتا ہے تو آپ کیا کہتے ہیں؟ ذرا الفاظ پر غور کیجئے! اگر آپ مہمان کو انجینئر (ENGINEER) اور آرکیٹک (ARCHIETECT) کی طرف اشارہ کر کے یہ کہیں گے کہ صاحب! اس بیت الخلاء کو انہوں نے بنایا ہے تو وہ ناراض ہو جائے گا۔ وہ یہ کہے گا کہ آپ نے میری بڑی توہین کی ہے۔ اس لئے کہ میں نے تو صرف بیت الخلاء ہی نہیں بنایا ہے۔ سارے محل کو بنایا ہے اور سارے محل کے ساتھ بیت الخلاء بنانا کوئی بری بات نہیں ہے حکمت کی بات ہے۔ تو اس نے سارے محل کو بنایا ہے لیکن اگر آپ خاص طور پر بیت الخلاء کے بارے میں کہیں تو یہ اس کی اہانت ہے۔ اسی طرح اللہ کو خالق خنزیر کہنا جائز نہیں ہے۔ اللہ کو شراب کا خالق کہنا جائز نہیں ہے۔

حق و باطل کی جنگ چلتی رہے گی تو مطلب میرے کہنے کا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دن بھی پیدا کیا۔ رات بھی پیدا کی۔ نور ایمان بھی پیدا کیا کفر کی ظلمت بھی پیدا کی۔ جنت بھی پیدا کی جہنم بھی پیدا کیا۔ حق بھی پیدا کیا۔ باطل بھی پیدا کیا۔ اور جس دن سے اللہ تعالیٰ نے یہ دو متضاد قسم کی چیزیں پیدا فرمائی ہیں اس دن سے خدا کا ایک قانون چل رہا ہے اور قیامت تک چلتا رہے گا اور وہ قانون یہ ہے کہ ظلمت اور نور۔ حق اور باطل، کفر

اور ایمان یہ دونوں آپس میں ٹکراتے رہیں گے ،ان میں آپسی تصادم ہوتا رہے گا ،ان میں آپس میں مقابلہ ہوتا رہے گا ۔ اللہ کی یہ سنت اور اللہ کا یہ طریقہ شروع سے چلا آرہا ہے۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں سے ہی یہ شروع ہوگیا۔ بلکہ اس سے بھی پہلے سے شروع ہوگیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے یہ کہا کہ تم بھی آدم کو سجدہ کرو۔ تاکہ آدم کی برتری کا اقرار تم سے ہو جائے ۔ تو آپ کو معلوم ہے کہ اس نے کیا کہا ؟ "ابیٰ" انکار کردیا ،اس نے کہا کہ نہیں ! یہ بات صحیح نہیں ہے کہ میں آدم کو سجدہ کروں بلکہ آدم کو چاہئے کہ وہ مجھے سجدہ کرے ۔ مقابلہ وہیں سے شروع ہوگیا۔

دنیا کیسے آباد ہوئی حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے ہیں ہابیل ،قابیل ۔ اس زمانہ کا طریقہ یہ تھا کہ صبح وشام یا ہرروز حضرت حواء کو اولاد ہوتی تھی اور دو جڑواں بچے ہوتے تھے ،ایک لڑکا اور ایک لڑکی ،اور ایک پیٹ (حمل) سے جو لڑکا اور لڑکی پیدا ہوتے تھے ان دونوں کے درمیان نکاح جائز نہیں تھا البتہ دوسرے پیٹ سے جو لڑکا پیدا ہوتا تھا اس کا نکاح پہلے پیٹ سے پیدا ہونے والی لڑکی کے ساتھ اور پہلے پیٹ سے پیدا ہونے والے لڑکے کا نکاح دوسرے پیٹ سے پیدا ہونے والی لڑکی کے ساتھ جائز تھا حالانکہ یہ دونوں بھی بھائی بہن تھے مگر اس میں دو پیٹوں کا فرق ہو جاتا تھا ۔ ہابیل و قابیل یہ دونوں حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے ہیں ،انہیں دونوں کا واقعہ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ

ان دونوں بھائیوں کو باپ نے یہ بتادیا تھا کہ دیکھو ! ہماری شریعت جو ابھی بالکل پرائمری (PRIMARY) اور ابتدائی درجہ کی شریعت ہے اسکا حکم یہ ہے کہ ایک

پیٹ کے بہن بھائیوں کے درمیان نکاح جائز نہیں ہے۔ نکاح کیلئے پیٹ کا فرق ہونا چاہیے۔ ایک بیٹے نے قبول کرلیا اور یہ کہا کہ میں اس بہن سے شادی کروں گا جو دوسرے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے لیکن دوسرے بیٹے نے قبول نہیں کیا، اس نے کہا کہ میرے ساتھ جو بہن پیدا ہوئی ہے وہ حسین و خوبصورت ہے میں اسی سے نکاح کروں گا۔

جب قابیل نے حضرت آدم علیہ السلام کی بات نہیں مانی تو۔۔۔ حضرت آدم علیہ السلام نے بہت سمجھایا، بھائی نے بھی بہت سمجھایا کہ یہ جائز نہیں ہے، منشائے خداوندی کے خلاف ہے لیکن وہ نہیں مانا۔ تو حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے یہ بات کہی کہ خیر! یہ تو ہمارا کہنا ہے، چلو! ایک طریقہ یہ ہے کہ خدا کیا چاہتا ہے وہ معلوم کرلو اور وہ طریقہ یہ ہے کہ تم دونوں قربانی کیلئے کچھ رکھو! جس کی قربانی قبول ہو جائے وہ حق پر ہوگا اور جس کی قربانی قبول نہ ہو وہ حق پر نہیں ہوگا۔ اس سے مقصد حضرت آدم علیہ السلام کا یہ تھا کہ ارے میاں! اگر ہماری بات نہیں مانتے ہو تو خدا کی تو مانو!

چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں بیٹوں نے اپنی اپنی قربانی کی چیز رکھی، کسی نے گوشت رکھا، کسی نے گندم کی بالیاں رکھی، اور اس زمانہ میں قربانی کے قبولیت کی علامت یہ تھی کہ آسمان سے بجلی آتی تھی اور اس پر گر جاتی تھی، جسکی وجہ سے وہ جل جاتا تھا۔ یہ قبول ہونے کی علامت تھی۔ تو وہ بیٹا جو حضرت آدم علیہ السلام کی بات مانتا تھا (ہابیل) اس کی قربانی قبول ہو گئی اور دوسرا (قابیل) جس نے انکار کردیا اور جو یہ کہتا تھا کہ میں اپنے ساتھ پیدا ہوئی بہن سے نکاح کروں گا اس کی قربانی قبول نہیں ہوئی اور اس طریقہ سے اللہ کی رائے ظاہر ہو گئی لیکن اسے بڑا غصہ آیا۔

دنیا کا پہلا مقتول اس نے غصہ میں دوسرے بھائی سے کہا لَأَقْتُلَنَّكَ میں تجھے قتل کردوں گا۔ دوسرے بھائی نے جواب دیا

لَئِنْۢ بَسَطْتَ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ
اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ

اگر تو نے یہ ناپاک ارادہ کرلیا ہے کہ بغیر کسی وجہ کے اور بغیر کسی قصور کے تو مجھے قتل کردے گا تو بھائی تو جان؛ لیکن میں اس کے جواب میں ہاتھ اٹھا کر تجھے قتل کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میرے دل میں خدا کا خوف ہے۔ چنانچہ ایک بھائی (قابیل) نے دوسرے بھائی (ہابیل) کو قتل کردیا۔ یہ دنیا میں قتل کا پہلا واقعہ ہے اور حال یہ تھا کہ ابھی تک دنیا میں نہ کوئی انسان مرا ہے اور نہ کسی نے کسی کو قتل کیا ہے

دنیا کی ابتدائی حالت علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب اللہ نے اس کائنات کو پیدا کیا تو زمین کا کوئی چپہ بنجر نہیں تھا، زمین کا کوئی چپہ کھارا نہیں تھا کہ جس میں دھان نہ اگے۔ جس میں کوئی پیداوار نہ ہو اور یہ بھی لکھا ہے کہ روئے زمین پر کوئی درخت ایسا نہیں تھا جو پھلدار نہ ہو اور یہاں تک لکھا ہے کہ سمندر کا پانی بھی میٹھا تھا۔ لیکن فرمایا کہ جب دنیا میں انسان نے سب سے پہلا گناہ کیا، بس اس گناہ کا ہونا تھا کہ اور بھی گناہ ہوتے چلے گئے۔ اور جوں جوں انسانوں کے گناہ بڑھتے چلے گئے زمین بنجر ہوتی چلی گئی اور زمین سے ایسے درخت پیدا ہونے لگے کہ جس میں پھل نہیں کانٹے ہوتے ہیں، یہاں تک کہ سمندر کا پانی بھی کڑوا ہوگیا۔ اور یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں، علامہ آلوسی بغدادی رحمہ اللہ علیہ جو عراق میں ایک بڑے عالم گذرے ہیں تیس جلدوں کے اندر ان کی ایک تفسیر ہے جسکا نام "روح المعانی" ہے یہ بات انہوں نے اپنی تفسیر کے اندر لکھی ہے۔

نوشیروان کیسے عادل بنا اور امام فخرالدین رازی رحمہ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک اور واقعہ لکھا ہے، میں نے شاید پہلے بھی بیان کیا ہے مگر کوئی حرج نہیں ہے، یہ قند مکرر ہے اس لئے کہ عود کو جتنا گھسو گے اتنی ہی خوشبو اس میں سے نکلے گی۔ امام فخرالدین

رازی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جس سال پیدا ہوئے وہ نوشیرواں عادل کا سال تھا۔ یعنی اس سال اس بادشاہ کی حکومت تھی جو نوشیرواں کے نام سے موسوم تھا اور عادل کی صفت کے ساتھ مشہور تھا۔ اور فرمایا کہ نوشیرواں عادل پہلے عادل نہیں تھا، اس کی زندگی میں ایسے واقعات گذرے ہیں کہ جن کی وجہ سے اللہ نے اس کو انصاف کا پابند بنا دیا۔

امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے نوشیرواں عادل کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ نوشیرواں عادل اپنے دوستوں کے ساتھ معمولی لباس پہن کر شکار کو گیا۔ کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ بادشاہ ہیں، شکار میں پھرتے پھرتے اسکو پیاس لگی، اس نے اپنے مصاحبین میں سے کسی سے پوچھا کہ میاں! یہاں قریب میں کوئی باغ ہے؟ اس نے کہا، ہاں! قریب میں ایک باغ ہے۔ وہ وہاں گیا اور جا کر مالی سے کہا، میاں! مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ تمہارے یہاں کچھ پینے کیلئے ہے؟ اس نے کہا، ہاں، اگر آپ کہیں تو پانی دے دوں اگر آپ کہیں تو پھلوں کا عرق دے دوں، پوچھا، کیا پھل ہے؟ اس نے کہا میرے یہاں انار کا پھل ہے۔ نوشیرواں عادل نے کہا، اچھا ایک انار توڑ کر لاؤ۔ وہ گیا اور ایک انار توڑ کر لایا اور نوشیرواں عادل کے سامنے ہی اس کے دانے نکالے۔ نوشیرواں عادل کہتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے اتنے بڑے دانے والا انار نہیں دیکھا اور جب اس مالی نے اس کا عرق نکال کر نوشرواں عادل کو دیا اور وہ اس کو پیا تو بے اختیار کہنے لگا "اللہ اکبر" میرے ہی ملک میں ایسا باغ ہے اور مجھے پتہ نہیں؟ نوشیرواں عادل نے اپنے دل میں یہ خیال کیا رئیں تو اس ملک کا بادشاہ ہوں، میں اس باغ پر قبضہ کرلوں گا۔ اس کے پاس رہنے نہیں دوں گا۔

نیت کا فتور برکت سے محرومی کا باعث

تھوڑی دیر کے بعد نوشیرواں عادل نے پھر مالی سے کہا کہ اچھا بھائی! اب ہم جا رہے ہیں، ایک انار اور لے آؤ، وہ دوسرا

انار لیکر آیا۔ اس کے دانے نکالے اور اس کا جوس (JUICE) بنا کر نوشیروان عادل کو دیا۔ نوشیروان عادل نے اس مالی سے کہا، یار! اسی درخت سے لائے ہوتے جس میں سے پہلا انار لائے تھے۔ اس نے کہا، حضور! یہ تو اسی درخت میں سے لایا ہوں۔ اس نے کہا! اس میں سے تو اتنا عرق نہیں نکلا اور اس کا مزہ بھی ویسا نہیں ہے؟ کیا بات ہے؟ مالی کہتا ہے کہ جی حضور! ایسا لگتا ہے کہ اس ملک کے بادشاہ نے ظلم کا ارادہ کرلیا ہے جو پھلوں کا عرق خشک ہوگیا ہے اور اس کا مزہ پھیکا ہوگیا ہے! نوشیروان عادل کہتا ہے کہ مجھے یہ خیال ہوا کہ اگر میرے ظلم سے خلق خدا پریشانی میں مبتلا ہوتی ہے تو میری توبہ! یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جس پر میں نے کبھی سوچا نہیں تھا، آج پتہ چلا کہ انسانوں کے ظلم سے پھلوں کے عرق بھی خشک ہوجاتے ہیں، چنانچہ اس نے یہ طے کرلیا کہ مجھے یہ باغ نہیں لینا ہے۔ اس کے بعد جب چلنے لگا تو کہا کہ بھائی! اب تو میرا یہاں آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے، ایک انار اور لیکر آؤ۔ مالی ایک انار اور لیکر آیا، اس کے دانے نکالے اور رس نچوڑ کر نوشیروان عادل کو دیا تو وہ حیران رہ گیا، یہ انار بہت اعلیٰ تھا، اس میں رس بھی بہت زیادہ تھا اور اس کا ذائقہ بھی بہت عمدہ تھا، نوشیروان عادل نے مالی سے کہا کہ بھائی! یہ کس درخت میں سے لائے ہو؟ اس نے کہا، جی حضور! یہ بھی اسی درخت سے لایا ہوں، نوشیروان عادل کہتا ہے کہ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس انار کا عرق بھی زیادہ ہے اور اس کا ذائقہ بھی بہت اچھا ہے؟ امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مالی نے یہ جواب دیا کہ حضور! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے بادشاہ نے ظلم سے توبہ کرلیا ہے۔

ظلم سے روزی کیسے تنگ ہوتی ہے؟ اندازہ لگایئے کہ ظلم سے انسان کی معیشت تنگ ہوجاتی ہے، انسان کی نافرمانی اور انسان کی معصیت سے انسان کی روزی تنگ ہوجاتی ہے اور جب انسان توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فراخی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

تو میں نے یہ عرض کیا کہ ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو قتل کر دیا۔ یہ دنیا کا پہلا گناہ ہے، یہ حق و باطل کا پہلا معرکہ ہے۔ ظلم و صبر کا پہلا مظاہرہ ہے، ایک بھائی کی طرف سے ظلم کا اظہار ہوا تو دوسرے بھائی کی طرف سے صبر کا اظہار ہوا۔ جان دے دی مگر اس نے کہا اگر تو ایک گناہ کا ارادہ کر رہا ہے تو اس کے جواب میں میں کسی گناہ کا ارادہ نہیں کروں گا۔ یہ میرا شیوہ نہیں ہے۔

اگر آپ کو کوئی گالی دے تو اس کے جواب میں آپ بھی گالی دیں گے؟ کیا آپ یہی کہیں گے کہ اس نے گالی دی تھی اس لئے اس کے جواب میں میں نے بھی گالی دے دی؟

شیخ سعدی کا نقطہ نظر لیکن شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ برائی کا جواب برائی سے نہیں دینا چاہئے، اس لئے کہ اگر کسی آدمی کو کتا کاٹ لے تو کیا وہ آدمی یہ کہتا ہے کہ میں بھی جواب میں اس کتے کو کاٹوں گا؟ نہیں، وہ یہ کہتا ہے کہ یہ تو کتا تھا جو اس نے یہ حرکت کی میں تو انسان ہوں، میں ایسی حرکت کیوں کروں؟

تاریخ صبر بمقابلہ ظلم آپ نے دیکھا؟ حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے ہیں! ایک نے ظلم کا اظہار کیا تو دوسرے نے صبر کا مظاہرہ کیا، ایک حق پر ہے ایک باطل پر ہے۔ یہ مقابلہ اور یہ تصادم حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد سے چلا یہاں تک کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام آئے، حق و باطل کا معرکہ ہوتا رہا ع

ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی

جب دشمنوں نے انہیں تنگ کیا تو اپنے مکان کو یہاں تک کہ اپنے وطن کو بھی انہیں چھوڑنا پڑا ہے، انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے حق کو غالب کرنے کیلئے کیسی کیسی سختیاں برداشت کیں، ظالموں نے ظلم کا اظہار کیا صابروں نے صبر کا مظاہرہ کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نمرود اور اسکی قوم سے مقابلہ ہوا یہاں تک انہیں

آگ میں ڈال دیا گیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک بے قصور پر آگ کو گلزار بنا دیا۔ آگ کو ٹھنڈی کر دیا۔ فرمایا کہ۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرعون سے مقابلہ ہوا۔ اس کے جادوگروں سے مقابلہ ہوا ظالموں نے ظلم کیا۔ صابروں نے صبر کر کے دکھایا اور حق پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ سرکار دوعالم ﷺ کا زمانہ آیا آپ کو بھی اسی منزل سے گذرنا پڑا۔ اور میرے دوستو! یہ وہ عام منزل ہے کہ اس پر سے سب کو گذرنا ہے۔ جیسا کہ آپ نے سڑک پر دکان بنا رکھی ہے یا تخت بچھا رکھا ہے۔ اس کے سامنے سے سبھی کو گذرنا ہوگا کیونکہ اس سڑک پر یہی چیز ہے۔

یاد رکھئے! جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائی۔ ہے ان کے راستے میں کانٹے ضرور آتے ہیں۔ ان کو طرح طرح کی دشواریوں اور طرح طرح کی تکلیفوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ ان کو ہر قسم کی مخالفتوں سے گذرنا پڑتا ہے اور مخالفت بھی ایسی کہ خدا معاف کرے۔ بہت سے لوگ جو بیچارے کچے قسم کے ہوتے ہیں وہ مخالفت سے گھبرا جاتے ہیں اور بعضے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب انکی مخالفت ہوتی ہے تو وہ جا کر شکرانہ کے طور پر نفل نماز ادا کرتے ہیں۔

ولی کی علامت ایک نوکرانی کی نظر میں حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین رحمہ اللہ علیہ بہت بڑے اللہ والے تھے ساری دنیا ان کی معتقد تھی۔ حیدر آباد دکن کے کوئی صاحب ان کے پاس آئے اور آکر انہوں نے ایک کنیز اور باندی یا دوسرے لفظوں میں کہئے کہ ایک نوکرانی ان کی خدمت میں پیش کی اور کہا کہ یہ نوکرانی آپ کی خدمت کرے گی۔ آپ کا ناشتہ کھانا وغیرہ تیار کرے گی اور پھر نوکرانی سے کہدیا کہ میں نے تجھے حضرت سلطان جی کے حوالہ کر دیا ہے تو ان کی خدمت کرنا۔ تو وہ عورت کہتی ہے کہ

آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر مجھے حضرت سلطان جیؒ کے حوالہ کردیا جبکہ میں حضرت سلطان جیؒ کی معتقد نہیں ہوں۔ میں ان کو بزرگ نہیں سمجھتی۔ میں انہیں اللہ والا نہیں سمجھتی۔ اس لئے کہ میرے نزدیک اس درجہ کیلئے جو معیار ہے یہ اس پر پورے نہیں اترتے۔

عصر حاضر میں ولی کی خود ساختہ علامت اور آجکل تو لوگوں نے بزرگی کیلئے نئے نئے معیار بنا رکھے ہیں۔ میر ٹھ میں ایک صاحب تھے۔ ہمیشہ میلے اور گندے کپڑے پہنے رہتے تھے، کپڑوں پر جوئیں چلتی رہتی تھیں۔ اور بہت سے لوگ ان کے صرف اس لئے معتقد تھے کہ ان کے کپڑوں میں جوئیں بہت ہیں۔ اور جب لوگ ان سے کہتے کہ ارے صاحب! آپ کے کپڑوں میں اتنی جوئیں ہو گئی ہیں آپ انہیں ماریئے تو وہ کہتے تھے کہ بھائی! میں ان جوؤں کو نہیں مارتا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روزی میرے بدن میں اتاری ہے۔

اب آپ ایمانداری سے بتایئے کہ کیا کہیں قرآن و سنت میں یا اکابر اولیاء اللہ اور بزرگان دین سے جوئیں پالنے کو بھی بزرگی کی نشانی سنا ہے؟ کس نے کہا آپ سے کہ یہ بزرگی کی نشانی ہے؟

ولی کی علامت ایک دیہاتی کی نظر میں میرے طالب علمی کے زمانہ میں ایک گاؤں دار آیا اور کہنے لگا کہ شیخ الحدیث صاحب کہاں؟ اس کا اشارہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ علیہ کی طرف تھا۔ میں نے بتادیا کہ بھائی! ان کا وہ مکان ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ کیا بات ہے؟ وہ کہنے لگا کہ جی! میں گاؤں سے آیا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ بڑے بزرگ ہیں لیکن میں تو بزرگی کو مانتا نہیں البتہ ان کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ زمین پر بیٹھا کر باجرے کی روٹی اور دال کھلاؤں گا۔ اگر انہوں نے میری دعوت قبول کرلی اور میرے یہاں آکر دعوت کھالی تب میں سمجھوں گا کہ یہ اللہ والے اور بزرگ ہیں۔ ارے

بھائی اللہ کے بندے! کونسی کتاب میں بزرگی کی یہ نشانی لکھی ہوئی ہے؟ بہت سے لوگ ایسے بھی تو ہوتے ہیں کہ ان کا معدہ کمزور ہوتا ہے اس لئے باجرہ کی روٹی نہیں کھاسکتے؟

خواجہ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کا اظہار عجز حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ علیہ نے کسی کتاب میں یہ پڑھ لیا تھا کہ سرکار دو عالم ﷺ بغیر چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھاتے تھے۔ انہوں نے بھی باورچی سے کہدیا کہ آج سے بغیر چھنے آٹے کی روٹی پکانا۔ چنانچہ وہ پکا کر لایا۔ لیکن چونکہ بغیر چھنے ہوئے آٹا میں بھونسہ زیادہ ہوتا ہے اس لئے جب انہوں نے کھایا اور عادت تھی نہیں پیٹ میں درد ہوگیا۔ مگر ادب تھا اس لئے زبان سے خلاف ادب کوئی لفظ نہیں نکالا۔ آجکل اگر ہم اور آپ جیسے لوگ ہوتے تو فوراً یہ کہدیتے کہ ارے بھائی! ہم تو اس سنت سے باز آئے۔ لیکن حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ نے خلاف ادب کوئی جملہ نہیں کیا، بلکہ باروچی کو بلا کر فرمایا کہ بھائی دیکھو! ہم نے تم سے کہا تھا کہ بغیر چھنے آٹے کی روٹی پکانا کیونکہ حضور اکرم ﷺ ایسا ہی کھایا کرتے تھے مگر ہم بڑے بے ادب اور گستاخ نکلے کہ ہم حضور اکرم ﷺ کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ہم آپ ﷺ کا مقابلہ نہیں کر سکتے، ہم اس قابل نہیں ہیں اور اسکا ہم اقرار کرتے ہیں اس لئے آئندہ سے تم آٹے کو چھان کر روٹی پکانا۔

تو میں نے اس دیہاتی سے کہا کہ بھائی باجرہ کی روٹی اور دال زمین پر بیٹھ کر کھانا یہ کوئی بزرگی کی نشانی تو نہیں ہے، بعضے ایسے بھی تو ہوتے ہیں جو معدہ کے کمزور ہونے کی وجہ سے باجرہ کی روٹی نہیں کھا سکتے۔ اور تو مسور کی دال اور روٹی پکا کر کہے کہ صاحب! زمین پر بیٹھ کر کھاؤ، ہوسکتا ہے کہ کسی کے گھٹنے میں درد ہو اور وہ بیٹھ ہی نہ سکے؟ یہ کہاں کی بزرگی ہے؟ اس کے بعد کا قصہ تو مجھے معلوم نہیں ہے لیکن ہمارے اکابر و بزرگان دین

کی شان یہ تھی کہ انہیں اس بات میں کبھی عار نہیں تھا کہ وہ دال روٹی زمین پر بیٹھ کر کھالیں۔ لیکن ہاں! بعض پیروں کا قصہ میں نے سنا ہے۔

پیٹو پیر کی بوکھلاہٹ کسی غریب نے آکر ایک پیر صاحب سے کہا کہ پیر صاحب! آپ تو بہت دعوتیں کھاتے رہتے ہیں ایک مرتبہ اس غریب کی بھی دال روٹی کھا لیجئے! پیر صاحب نے یہ سوچا کہ میاں! سبھی تو دال روٹی ہی کہتے ہیں مگر کھلاتے تو مرغیاں ہی ہیں۔ یہ بھی دال روٹی کہہ رہا ہے مگر مرغی ہی کھلائے گا۔ انہوں نے دعوت قبول کرلی۔ اب جو وہاں پہنچے تو دیکھتے ہیں کہ واقعی دال روٹی ہی رکھی ہوئی ہے۔ پیر صاحب سوچنے لگے کہ یہ تو بڑا نالائق نکلا، مجھ سے تو ایک لقمہ بھی نہیں چلے گا۔ اب اگر میں چھوڑ کر جاتا ہوں تو یہ بدنام کرے گا۔ اور کھاتا ہوں تو کھایا نہیں جاتا۔ پیر صاحب اسی سوچ میں تھے کہ ایک کتا آکر سامنے بیٹھ گیا۔ تو وہ جو دعوت کرنے والا تھا اس نے کتے کو بھگایا، وہ بھاگ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آکر بیٹھ گیا پھر اس نے بھگایا پھر آکر بیٹھ گیا تو دعوت کرنے والا کتے سے کہتا ہے کہ ارے بھاگ جا! ورنہ پتھر سے تیرا سر پھوڑ دوں گا۔ تو پیر صاحب کو موقعہ مل گیا، وہ کتے سے کہنے لگے۔ تو اس کا کہنا مان لے یہ آدمی ایسا ہے کہ جو کہتا ہے وہ کرکے دکھا دیتا ہے، اس کے یہاں حقیقت ہی حقیقت ہے مجاز کا کوئی نام ونشان نہیں ہے۔ مجھ سے بھی کہا، دال روٹی کھلاؤں گا اور واقعی وہی لاکر رکھ دیا۔ تو میں نے کہا کہ آجکل لوگوں نے بزرگی کیلئے نئی نئی نشانیاں بنالی ہیں۔

حضرت رکانہؓ دررسول ﷺ پر ایک شخص جنکا نام رکانہ تھا سرکار دوعالم ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ یارسول اللہ ﷺ! میں تو عربی کی فصاحت و بلاغت کو نہیں جانتا۔ معجزہ کو نہیں سمجھتا، میں تو پہلوان ہوں، میں آپ سے کشتی لڑنا چاہتا ہوں اگر آپ مجھے چت کردیں گے تو میں مان لوں گا کہ آپ سچے نبی ہیں میں آپ پر ایمان لے آؤں گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ نے قبول کرلیا اور حضرت رکانہ

رضی اللہ عنہ سے مقابلہ کیا،حضرت رکانہؓ مقابلہ میں چت ہوگئے۔ سرکار دو عالم ﷺ اوپر ہیں اور حضرت رکانہؓ نیچے ہیں۔ اور جب حضرت رکانہؓ نے دیکھا کہ سرکار دو عالم ﷺ کا جسم اطہر میرے جسم سے لگ رہا ہے تو وہ اور زیادہ اپنے جسم کو آپ کے جسم سے رگڑنے لگے۔ اس لئے کہ یہ موقعہ پھر کب ملے گا۔ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرلیا (۱)۔

نبی جامع الکمالات ہوتے ہیں

لیکن یہ بات اور تھی، یہاں اس واقعہ سے اللہ تعالیٰ کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ اللہ تعالیٰ جنکو نبوت عطا فرماتا ہے ان کے اندر دنیا کے سارے کمالات ہوتے ہیں، کوئی کمال ایسا نہیں ہوتا کہ جس میں کوئی انسان نبی سے آگے بڑھ جائے چاہے وہ جسمانی طاقت ہو چاہے وہ قوت بیان اور قوت گویائی ہو، چاہے وہ حسن ہو، چاہے وہ علم ہو، چاہے وہ عبادت ہو۔ کسی کمال کے اندر بھی کوئی انسان نبی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

نوکرانی کا استدلال ولایت کی علامت پر

خیر! میں حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ عرض کررہا تھا کہ اس عورت نے اپنے آقا سے کہا کہ آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر مجھے حضرت سلطان جیؒ کے حوالہ کردیا جبکہ میں ان کی معتقد نہیں ہوں۔ کیوں؟ آپ حضرات اس عورت کے اس نقطۂ نظر کو یاد رکھے گا۔ اس نے کہا کہ میں اس کی معتقد ہوں گی جس کے دشمن اور مخالفین دنیا میں موجود ہوں۔ اس لئے کہ سرکار دو عالم ﷺ جب حق کے راستے سے گذرے تو انہیں مخالفت اور دشمنی سے سابقہ پڑا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گذرے، انہیں بھی مخالفت و دشمنی سے سابقہ پڑا، ائمہ کرام رحمھم اللہ اجمعین گذرے انہیں بھی مخالفت و دشمنی سے سابقہ پڑا، اولیاء کرام گذرے انہیں بھی مخالفت و دشمنی سے سابقہ پڑا۔ لیکن میں دیکھتی ہوں کہ حضرت سلطان جیؒ کا

(۱) ترمذی شریف ج ۱/ ۳۰۸

نہ کوئی مخالف ہے اور نہ کوئی دشمن ہے اس لئے میرا یہ خیال ہے کہ یہ حق کے راستے ہی پر نہیں ہیں۔ اگر یہ حق کے راستہ پر ہوتے تو وہی منزل ان کو بھی ملتی۔

آقا نے کہا کہ تُو تو بڑی منطقی نکلی، میں نے تو اس طرح سے کبھی غور ہی نہیں کیا ہے لیکن یہ کہ میں ان کا معتقد ہوں اس لئے ایسا کرو کہ تم حضرت سلطان جی خدمت میں رہو پھر بھی اگر تمہارے دل میں اعتقاد پیدا نہ ہو تو تم ایک دو روز کے بعد واپس آجانا۔ اس نے کہا، اچھا! وہ وہاں رہ گئی۔

نوکرانی بھی سلطان الاولیاء کی معتقد ہو گئی اگلے دن جب صبح ہوئی تو اس زمانہ میں کھانا پکانے کیلئے چونکہ لکڑیاں جلتی تھی جس کی وجہ سے مکانوں سے دھواں نکلتا تھا اسی طرح پڑوس کے ایک مکان سے دھواں نکل رہا تھا، یہ اس مکان میں گئی اور جا کر کہا کہ میں سلطان جی کی نوکرانی ہوں، مجھے ان کیلئے ناشتہ بنانا ہے اس لئے آگ لینے آئی ہوں۔ ذرا ایک دو انگارے مجھے دے دو تاکہ میں جلدی سے حضرت سلطان جی کیلئے ناشتہ تیار کردوں۔ یہ سنتے ہی وہ گھر والی عورت کہنے لگی۔ اچھا! تو سلطان جی کی نوکرانی ہے ؟ دیکھ لو! ہمیں آگ دینے میں تو کوئی اعتراض نہیں ہے باقی سلطان جی کیلئے ہم آگ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ اور ان کو بہت سی گالیاں اور صلوٰتیں سنائیں۔ اب یہ عورت کہنے لگی کہ آج تک تو میں ان کی معتقد نہیں تھی لیکن اب معتقد ہو گئی کیونکہ ان کے بھی دشمن ہیں۔ اب تک تو میرا یہ خیال تھا کہ ان کا کوئی دشمن نہیں ہے مگر اب پتہ چلا کہ ان کے بھی دشمن دنیا میں موجود ہیں۔

اکبر بادشاہ کے دربار کا ایک نوٹنکی شاہنشاہ اکبر کے زمانہ کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ اس کے یہاں ہمیشہ ایسے ہی ناٹک اور ڈرامے ہوتے رہتے تھے، ایک مرتبہ کسی نے کہدیا کہ آئیے صاحب! مجلس نبوت بنائیں، پوچھا کہ کس طرح بنائیں؟ کہنے لگا کہ ہم میں سے ایک کو نبی بنا کر باقی کسی کو ابوبکر، کسی کو عمر، کسی کو عثمان اور کسی کو علی بنالیں

مجلس نبوت بن جائے گی! تو لوگوں نے اکبر سے کہا کہ صاحب! آپ تو نبی ہیں اور یہ جتنے آپ کے آس پاس بیٹھے ہوئے ہیں یہ سب ابو بکرؓ و عمر اور عثمان و علی ہیں! بیچارہ ملا دو پیازہ وہیں کہیں کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ کسی نے کہا۔ ارے یار! تم کہاں تھے؟ یہاں تو مجلس نبوت بھی بن گئی اور تم آئے نہیں؟ کہنے لگا۔ اچھا! مجلس نبوت بن گئی؟ انہوں نے کہا ہاں! بن گئی! ملا دو پیازہ نے کہا۔ پھر بتاؤ اس نبی کا ابو جہل کہاں ہے؟ انہوں نے کہا۔ ارے! ابو جہل کا یہاں کیا کام؟ کہنے لگے کہ کسی نبی کی نبوت اس وقت تک پوری نہیں ہوتی جب تک کہ اس کا کوئی ابو جہل نہ ہو۔ یہ ابو بکر و عمر و عثمان و علی تو بن گئے لیکن ابو جہل کہاں ہے؟ انہوں نے کہا۔ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کہنے لگے۔ میرا کوئی مطلب نہیں ہے۔ مجھے کوئی عہدہ نہیں چاہئے بس میں اسی نبی کا ابو جہل ہوں اور کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ میں اس نبی کا ابو جہل ہوں۔ یہ نبی جھوٹا ہے اور لعنة الله على الكذبين اس نبی پر اللہ کی لعنت ہو اور اس کے ساتھیوں پر بھی اللہ کی لعنت ہو۔ خیر! تو میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ حق و باطل کے درمیان اس وقت سے معرکہ آرائی چل رہی ہے جب سے کہ دنیا قائم ہے یہاں تک کہ سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھ بھی یہ معرکہ پیش آیا۔ مکہ میں آپ پر کیا قیامت گذری لیکن آپ صہ کا مظاہرہ کرتے رہے کیونکہ آپؐ کو یہ معلوم تھا کہ مقابلہ جتنا سخت ہو گا خدا کے یہاں مرتبہ اتنا ہی بلند ہو گا۔

شہادت حسین رضی اللہ عنہ بھی معرکہ حق و باطل کی ایک اہم کڑی ہے

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی اسی معرکہ حق و باطل کا ایک حصہ ہے۔ آپؓ کی شہادت کا درجہ اور مقام اسی لئے بہت اونچا ہے کہ آپؓ نے دین کی حمایت کیلئے۔ سنت رسول کی حمایت کیلئے اور اسلام کی حفاظت کیلئے مقابلہ کرتے ہوئے جان دے دی۔ خلافت و امارت کیلئے مقابلہ نہیں کیا۔ میرے دوستو! حضرت حسینؓ کی یہ شہادت

قیامت تک یاد گار رہے گی۔ علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے اور صحیح کہا ہے فرمایا کہ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرار بولہبی

نبوت کا چراغ نبوت کا نور ہے اور شرار ابولہب کفر ہے۔ کفر نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ نور نبوت کو ختم کر دیا جائے لیکن نور ہمیشہ غالب آتا رہا ہے البتہ وہ قربانیاں مانگتا ہے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ قربانیاں دینے والوں نے اس کیلئے ہر طرح کی قربانی دی ہے یہاں تک کہ شہادت کے بلند اور اونچے مراتب پر فائز ہوئے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی جان کو قربان کر کے حق کو غالب اور روشن کیا ہے۔

غرضیکہ حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی اللہ کی قدیم سنت ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی یہ صورت سامنے آئی چنانچہ اللہ کی حمایت اور اسکے تحفظ کیلئے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مقابلہ کیا اور اس مقابلہ کے اندر اپنی قیمتی جان کو قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اس کے بارے میں انشاء اللہ کل دوسری نشست کے اندر تفصیل کے ساتھ واقعات پیش کروں گا۔ اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا
اتباعہ وارنا الباطل وارزقنا اجتنابہ
سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون
وسلام علی المرسلین
والحمد للہ رب العلمین